فسانۂ خونِ دل کا

امتیاز فاطمی

نام	امتیاز بانو
قلمی نام	امتیاز فاطمی
شوہر	خادم حسین اشرف
تعلیم	ایم اے، بی ایڈ
	ریٹائرڈ ہیڈ مسٹریس، مڈل اسکول، مظفر پور
بچے	سید معصوم اشرف، سید شبیر اشرف، عترت فاطمی
وطن	کمرہ محلہ، مظفر پور، بہار
تصانیف	ڈوبتی شام، فسانہ خون دل
ایوارڈ	ہم قلم، رام پور (شمع بجھتی ہے تو) مجاہد اسلام کمیٹی، مظفر پور (ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا)

مشاغل

نائب صدر	آل انڈیا ویمنس اسلامی کلچر رائٹرس ایسوسی ایشن، حیدر آباد
چیف ایڈیٹر	سہ ماہی 'صدف' مظفر پور

اردو، ہندی زبانوں میں افسانے، ڈرامے اور مختلف موضوعات پر ملک اور بیرون ملک کے ادبی رسالوں اور مقامی اردو اور ہندی اخباروں میں شائع اور آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہوئے۔

فسانہ خونِ دل کا

(افسانوی مجموعہ)

امتیاز فاطمی

شہباز پبلی کیشنز

بلگرام ہاؤس، محلّہ، کمرہ، چندوارہ، مظفرپور۔ 842001 (بہار)

فون: 9334910058,0621-2241186

نام کتاب	:	فسانہ خون دل کا (افسانوی مجموعہ)
مصنفہ	:	امتیاز فاطمی
اشاعت	:	۲۰۰۶ء
ضخامت	:	۲۴۰ صفحات
قیمت	:	۲۰۰/روپے
ناشر	:	سید معصوم اشرف، غازی آباد (یوپی)
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	قمر تبریز صدیقی، شبیر احمد
سرورق	:	فریدالحق، دہلی 9811883369
زیر اہتمام	:	سید معصوم رضا عشروی، نئی دہلی
تقسیم کار	ا۔	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، بہار
	۲۔	ملک بک ڈپو، ۳۲۱۲، ترکمان گیٹ، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
	۳۔	معصوم اشرف، M-1/19، شکشا اپارٹمنٹ، وسندھرا غازی آباد۔ فون: 2328921

Fasana Khoon e Dil Ka

(Afsanvi Majmuaa)

by ***Imteyaz Fatimi***

First Edition 2006

Price Rs. 200/=

انتساب

اپنے شفیق والد محترم

جناب بہزاد فاطمی کے نام

جنھوں نے اپنی بے مثال تعلیم و تربیت کے ساتھ میری پرورش کی اور مجھے اس قابل بنایا کے میرے ہاتھ میں قلم آ گیا۔

اور

والدہ محترمہ رباب بانو کے نام

جن کے ممتا بھرے آنچل نے زندگی کی کڑی دھوپ میں چلتے ہوئے مجھے آبلہ پا ہونے سے بچا لیا۔

فہرست

پیش لفظ

سماجی حالات کی وجہ سے ہندوستانی خواتین زندگی کے دوسرے شعبوں میں خواہ بعد میں آئی ہوں۔ لیکن قلم کی دھنی ہمیشہ سے رہی ہیں۔ جذبات کی شدت اوران کے اظہار کی خواہش مردوں کے مقابلے میں ان کے اندر کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی تعلیم کو پسِ پشت نہ ڈالا گیا ہوتا۔ اوران پر اتنی پابندیاں نہ لگائی گئی ہوتیں۔ تو شائد ان میں قلم کاروں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ ادب کی جن اصناف کو انہوں نے ہاتھ لگایا۔ وصف کے اعتبار سے بھی شائد وہ زیادہ اونچے درجے کی ہوتیں۔ بہر حال امتیاز فاطمی اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ جو کی سوسال پر محیط ہے۔ ان میں نہ جانے کتنے ایسے نام ہوں گے۔ جو منظرِ عام پر آ بھی نہ سکے ہوں گے۔

امتیاز فاطمی نے اظہارِ خیال کے لئے افسانوی ادب کو ذریعہ بنایا ہے۔ خاصے عرصے سے لکھ رہی ہیں۔ اوران کے افسانوں نے مختلف رسالوں میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ ماہِ رخ۔ پاکیزہ

آنچل، کبریٰ، زبان وادب اور بانو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام رسالوں میں ان کے افسانے وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے پاس اظہار کی صلاحیت تھی۔ ایک جاں گداز حادثے نے قلب ونظر میں ہل چل مچائی۔ اور دل کا درد افسانوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اپنے خول میں سمٹ جانے یا گریہ وزاری کرتے رہنے کی بجائے انہوں نے ایک مثبت اور تعمیری شغل میں پناہ لی۔ ابتداء یوں ہوئی۔ لیکن افسوسناک صورت حال میں خوشی کا پہلو یہ ہے کہ اس تعمیری اور مثبت عمل کو انہوں نے جاری رکھا۔

۱۹۸۲ء سے ان کا ادبی سفراب تک جاری ہے۔ ان کے ذوق وشوق سے امید ہے کہ آگے بھی جاری رہے گا۔ اس درمیان بہار میں کئی افسانہ نگار خواتین ابھریں۔ لیکن اپنی ادبی کاوشوں کو جاری نہ رکھ سکیں۔ اس لحاظ سے امتیاز فاطمی واقعی ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ میں نے ان کے بیشتر افسانوں کو خلوص نیت کے ساتھ بغور پڑھا۔ نہایت سیدھے سادھے افسانے ہیں۔ جو ایک سیدھی سادھی شخصیت کا پتہ دیتے ہیں۔ انہوں نے گرد وپیش کے مسئلوں اور واقعات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً 'جہیز کی لعنت' 'تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں' 'جھوٹی شان وشوکت کا کھوکھلا پن' 'اپنا اپنا ظرف' 'ایک کمزور سی عورت کا مضبوط عزم واستقلال' 'مٹی کے دیئے اور خودار' 'شمع مزار' وغیرہ وغیرہ۔ زبان سلیس اور رواں ہے شاد عظیم آبادی سے قریبی تعلق رکھنے والی خاتون سے توقع بھی یہی کی جائے گی۔ امتیاز فاطمی صاحبہ سے میرا پرخلوص مشورہ ہے کہ وہ اپنا یہ ادبی سفر جاری رکھیں۔ تاکہ اردو ادب کو ایک نئی تازگی ملتی رہے۔ میں ایک خاتون ادیب سے اس کی توقع اور درخواست دونوں کا حق رکھتی ہوں۔

ذکیہ مشہدی

تعارف

کہانی کا عمل عالم طفلی سے سن شعور تک اپنے مختلف رنگوں کے ساتھ انسانی ذہن پر ابھرتا اور ڈوبتا رہتا ہے اور انسانی شعور کے اسی جذبے نے سرزمین ادب پر بے شمار ادیبوں کو جنم دیا ہے۔ مگر ایسے ادیب اور کہانی کار بہت ہی کم گزرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں کامیابی اور شہرت حاصل کرلی ہو۔ اس سلسلے میں مجھے آج یہ کہتے ہوئے ایک فخر سا محسوس ہورہا ہے کہ امتیاز فاطمی نے بہت ہی مختصر سے عرصے میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کرلی ہے۔ انھوں نے جس محنت اور لگن کے ساتھ ادبی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا ہے وہ قابل صد ستائش ہے۔

آج کے سماج میں عورت کی مجبوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ کئی سالوں سے کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ انھوں نے منشی پریم چند سے لے کر بیدی تک کسی بھی افسانہ نگار کی اندھی تقلید نہیں کی۔ بلکہ عورت کے مختلف رنگوں کو جملوں کا ہار پہنا کر اپنے فن کو ایک الگ انداز سے عوام کے

سامنے پیش کیا ہے۔ اپنے اس فن کے ذریعے جہاں انھوں نے جہیز کے خلاف نعرہ حق بلند کیا ہے۔ وہیں عورتوں کو پستی کی طرف سے اٹھا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا حوصلہ بھی بخشا ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے جن کہانیوں کو شامل کیا ہے ان کا رشتہ کہیں نہ کہیں سے عورت کی نفسیات کو چھوتا ہوا گزرتا ہے۔

امتیاز فاطمی کی حساس طبیعت کو ان کے ان افسانوں میں پہچانا جاسکتا ہے۔

بہرحال اب میں امتیاز فاطمی کو ان کے اس مجموعے کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان سے یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ آگے بھی اپنے اس سفر کو جاری رکھیں گی۔ ہماری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں اور یہ دلی دعا ہے کہ یہ 'فسانہ خونِ دل کا؟؟' ان کے لیے ایک نئی سحر کا پیام لے کر آئے۔

ش۔اختر

پسِ منظر

امتیاز فاطمی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ڈوبتی شام'' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کے پیشِ لفظ میں ''شکیلہ اختر نے لکھا تھا۔

''شاد کی پر پوتی ہونے کی صورت میں انہیں (امتیاز فاطمی) شاعرہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر شاد کا ایک ناول بھی تو تھا۔ یہی نثر نگاری شاد کی پر پوتی کو وراثت میں ملی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے۔'' اس خاندان میں ادب اور شاعری سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ شاید یہ تسلی طرۂ امتیاز ہے یا اس عظیم فنکار کے ماحول کا حسنِ انتخاب کہ امتیاز فاطمی نے جس جدوجہد سے اپنی تعلیم حاصل کی اور اب اپنی گھریلو ذمہ داریوں اور سروس کو قائم رکھتے ہوئے جس لگن اور ہمت سے اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں۔ وہ قابلِ ستائش ہے۔''

امتیاز فاطمی کا خاندان پشتہا پشت سے رضا کارانہ طور پر اردو ادب کی بے لوث خدمت

کرتا رہا ہے۔ بزرگوں کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ ریاست وامارت کے مقابلے میں علم وادب کا پلہ گراں رہے۔ علم وادب کے خدمت گاروں میں شاد عظیم آبادی کی حیثیت بہت بلند ہے۔ لہذا بجا طور پر یہ کیا جاسکتا ہے کہ امتیاز کا رجحان علم وادب کی جانب خودرونہیں بلکہ یہ چیز انہیں وراثت کے طور پر ملی ہے۔

امتیاز کے بچپن میں ان کی والدہ مرحومہ رباب بانو انہیں اسماعیل میرٹھی کی ہلکی پھلکی نظموں اور کہانیوں کی لوریاں سنایا کرتی تھیں۔ جب حروف پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو دہلی سے شائع ہونے والا رسالہ ''کھلونا'' منگوا کر پڑھواتیں۔ اور سنانے کو کہتیں۔ سن شعور کو پہنچیں تو زینت کوثر کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے 'بانو' کی مستقل خریدار بن گئیں۔ میرا خیال ہے کہ بچپن میں دی گئی اس طرح کی تعلیم کے ذریعہ اسی وقت ان کے ذہن میں کہانیاں بننے کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ جو لاشعور میں کہیں پوشیدہ تھی۔ جسے وقت نے جھنجھوڑ کر باہر نکال دیا۔ کیونکہ گھریلو ذمہ داریوں اور سروس کی مشغولیت کے باوجود انہیں کس طرح افسانے لکھنے کی تحریک ملی۔ اس کے متعلق وہ خود لکھ چکی ہیں۔ ان دنوں وہ آل انڈیا ویمنس اسلامک کلچرل رائٹرس ایسوسی ایشن کی نائب صدر ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کی صدر محترمہ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ صاحبہ ہیں۔ اس کی شاخیں انہوں نے بیرونِ ملک تک منسلک کی ہیں۔ آل انڈیا کی نائب صدر ہونے کے ناطے امتیاز فاطمی نے اپنے شہر مظفر پور میں بھی خاطر خواہ کارکردگی کو انجام دیا ہے۔

سرکاری ملازمت کے سلسلے میں آئے دن میرا تبادلہ ہوتا رہا۔ پرائیویٹ طور پر امتحان دے کر آئی۔اے۔ پاس کیا۔ آئی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد ان کی شادی سید خادم حسین اشرف سلمہ سے ہوگئی۔ مگر شادی کے بعد اپنی بے انتہا ذمہ داریوں کے باوجود انہوں نے ۔ایم۔اے۔ بی۔ایڈ۔ تک تعلیم حاصل کی۔ خادم حسین سلمہ کے نانا محمد امیر بلگرامی مرحوم کا شمار مظفر پور کے معززین میں تھا۔ یہ خاندان ہمیشہ سے مذہبی روایتوں کا پابند رہا۔ ادب سے بس اتنا

ہی سروکار تھا کہ مجالس عزا میں کس مرثیہ نگار کا کیا انداز تھا اور کس مقرر میں کتنی ادبیت تھی۔ اس ماحول میں آنے کے بعد امتیاز فاطمی کے ذہن نے بھی ان اثرات کو قبول کیا۔ اور بچپن میں اس ماحول سے دوری کے باوجود جب انہیں شادی کے بعد یہ نعمت حاصل ہوئی تو وہ ماشاءاللہ اس سے بھی منسلک ہوگئیں اور اپنے گھر میں اہتمام عزاداری کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی محفلوں مجلسوں میں ذاکری کرنے لگیں۔ خدا نے انہیں دو بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ جن کے اندر اپنی والدہ کی جملہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ ان کے بھی بچے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا انہیں بھی عمرِ محنت، عافیت، ترقی و اقبال عطا کرے۔ آمین!

بہزاد فاطمی

پٹنہ

عکسِ خیال

علم حاصل کرنا انسان کی فطرت ہے۔ جیسے انسان مختلف ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ علم کے بغیر انسانی وجود اپنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حصولِ علم کا ایک ذریعہ مطالعہ کتب بھی ہے۔ مطالعہ کتب کا شوق ہی میرے علم حاصل کرنے کا ذریعہ بنا۔ جو رفتہ رفتہ کہانیاں لکھنے کا فن اختیار کر گیا۔ اور پھر وہ حالات جن میں دکھ واذیت کے کانٹے ہیں۔ انہوں نے قلم کو ایک نئی طاقت بخشی۔ اور قلم کے ہاتھ میں آتے ہی ورق ورق زندگی کاغذ کے صفحات پر بکھرنے لگی۔

کہانی کہنا اور سننا بھی انسانی فطرت میں داخل ہے۔

شاید دنیا کی سب سے پہلی کتاب وہ تھی جو آدم نے حوا سے اور حوا نے آدم سے کہی تھی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اور چراغ سے چراغ جل رہے ہیں۔ میرے افسانوں کا یہ تیسرا مجموعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ اس مجموعہ کی اشاعت سے افسانوی دنیا میں کوئی نیا انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ مگر اتنا احساس ضرور ہے کہ ایک خاتون کی

حیثیت سے میں نے ادب کی دنیا میں اپنا ایک مقام بنانے کے لئے جو جدوجہد کی ہے۔ وہ ادب کے قارئین کو کچھ سوچنے پر مجبور کردے گا۔

زندگی کے شب و روز گذارتے ہوئے انسانی قلب و دماغ جن واقعات یا حادثات سے متاثر ہوتا ہے وہ غیر شعوری طور پر اس افکار کو مختلف پیکروں میں ڈھالتا رہتا ہے۔ جب یہی اثرات کسی فنکار کے دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں تو ان کی کیفیت کچھ تبدیلی اختیار کرلیتی ہے۔ زندگی کا ہر وہ لمحہ، ہر وہ واقعہ اور جذبہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ جب وہ کسی فنکار کے دل کو چھولیتا ہے۔ تو وہ اس کے قلب میں اس وقت تک بے چین رہتا ہے جب تک وہ الفاظ کی صورت اختیار نہیں کرلیتا۔ چونکہ کہانی کا فن جگ بیتی کے ساتھ آپ بیتی بھی ہوتا ہے۔ اس لئے ہر وہ انسان جو اس صنف سے دلچسپی رکھتا ہے وہ اس بات کا بھی متلاشی رہتا ہے کہ اس صنف کے ذریعے اسے کہیں پر ایسی منزل مل جائے جہاں پر اس کی تھکی ہوتی بے چین روح کو قرار مل جائے۔

واقعات حالات حادثات جو انسان کے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں انہیں الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر کہانیوں کا رنگ دینا۔ ایک فنکار کی ذہنی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ خوابیدہ سے واقعات کو ایک واضح پیکر بنا کر سامنے لانا الفاظ کی بازی گری اور پر اثر اندازِ بیان کی دل پذیری کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ میں نے اپنے سیدھے سادھے آسان الفاظ میں زندگی پر مبنی واقعات کی جو صحیح عکاسی کی ہے وہ زادِ سفر بن کر قارئین کو میرے فن سے ضرور متاثر کریں گے۔

آخر میں ایک بار پھر میں اپنے بیٹے سید معصوم اشرف سلمہ کے لئے دعا گو ہوں۔ جن کی بے پایاں کاوشوں کی بدولت میرا یہ فن کتابت و اشاعت کی منزلوں سے گذر کر مجموعہ کی شکل میں قارئین کے سامنے آیا۔

امتیاز فاطمی

پتھر کی چٹان

گزرتے وقت کے کارواں کے ساتھ شمعی بھی ایک دن ہنستی کھیلتی چمنستان زندگی کی اس منزل پر آ پہنچی، جہاں بیٹی کے پہنچ جانے پر والدین کی سوچیں گہری ہونے لگتی ہیں۔ مگر اس سے پہلے کہ شمعی کے والدین کی سوچیں فکر میں تبدیل ہونے لگتیں ایک سجیلا سا خوبرو نوجوان ان کی چوکھٹ پر دولہا بن کر آ گیا اور بابل کی دعاؤں کے سائے تلے شمعی اس کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ شمعی کے کنوارے خوابوں نے ابھی کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی تھی۔ وہ حجلۂ عروسی کی مہکتی ہوئی خوابناک وادی کے کمرے میں دلہن بنی سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کے دل میں صرف ایک ارمان تھا۔ میری زندگی کی راہیں دلکش ہوں۔ اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے کپکپا رہے تھے۔ پروردگار میری زندگی کو پر مسرت بنانا۔ اس کے نرم و نازک حنائی ہاتھ اسے ایک سہانا خواب دکھا رہے تھے۔ اس نے اپنی نیم وا آنکھوں سے اپنے دلہن کے سجے سجائے روپ کو دیکھا۔ اور خود بخود شرم سے گلنار ہو گئی۔

چند ہی لمحوں کے بعد اسے اس بات کا احساس ہوا کہ دو مضبوط اور نپے تلے قدم رفتہ

رفتہ اس کی جانب بڑھے ہیں۔ وہ قدم جن کے ساتھ اسے اپنے قدم ملا کر زندگی کی طویل راہوں پر گامزن ہونا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔ تب ہی کوئی آہستگی کے ساتھ اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا اور اس کے بیٹھتے ہی ایک نرم سی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''آداب عرض کرتا ہوں حضور'' آواز کی اس نرمی سے اس کا پورا وجود موم کی طرح پگھلنے لگا اور اس کا سر آپ سے آپ گھٹنوں سے جا لگا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اس نے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں جذب کرنے کی کوشش کی تو طلائی کنگنوں کی کھنکنے کے ساتھ یکبارگی کانچ کی سرخ چوڑیاں ترنم خیز آواز کے ساتھ بج اٹھیں۔ اس آواز کے ابھرتے ہی دو گرم گرم گداز ہاتھوں نے اس کے دو ٹھنڈے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا پھر جلدی ہی اس نے اس کا گھونگھٹ الٹ کر اس کی ٹھوڑھی اپنی دو انگلیوں سے اوپر اٹھائی۔ چہرہ اوپر اٹھتے ہی شمعی نے گرم گرم سانسوں کا لمس محسوس کیا اور یکبارگی اپنی آنکھیں کھول دیں اور آنکھیں کھولنے پر اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس نے دیکھا کہ دو گہری آنکھیں حیرت واستعجاب میں ڈوبی اس کے نچلے ہونٹ پر آگے اس ننھے سے تل کو تک رہی ہیں جو اس کے بے پناہ حسن میں مزید اضافے کا سبب تھا۔ لیکن ان نگاہوں میں کوئی اشتیاق نہیں تھا، کوئی پسندیدگی کی جھلک نہیں تھی۔ بلکہ ان نگاہوں میں ایک تجسس تھا، ایک سوال تھا اور ان نگاہوں سے ایک ایسی نفرت وحقارت ٹپک رہی تھی کہ اس نے اس کا زہر اپنی روح کی گہرائیوں میں اترتے ہوئے محسوس کیا۔ اسے ایسا لگا کہ ان آنکھوں میں اس کے لیے پیار کا وہ سمندر ٹھاٹھیں نہیں مار رہا تھا جس کی تمنا میں ابھی کچھ دیر قبل اس کے ہونٹ خدا کے حضور میں دعا گو تھے۔ بلکہ ان میں تو اس کے لیے نفرت اور بیزاری کے ایسے شعلے دہک رہے تھے جس میں اس کا نازک وجود بھسم ہوا جا رہا تھا۔ اس کی تپش سے وہ راکھ ہو کر فضا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی شمعی کچھ سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا گھونگھٹ چھوڑ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

کمرے کا دروازہ اسی طرح کھلا رہ گیا اور وہ ان چھوئی دلہن اپنی سہاگ سیج پر گم سم سی تمام شب بیٹھی رہی۔ سہاگ کی سیج کو اپنی خوشبو سے معطر کرنے والی کلیاں کھل کھل کر پھول بنیں۔ پھر یہ پھول بھی مرجھا گئے اور ان کی پنکھڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بستر سے نیچے زمین پر گر گئیں۔ رات کی سیاہی نے رفتہ رفتہ اپنے پر سمیٹ لیے اور صبح صادق کی نورانی کرنوں نے کمرے کے اندر اجالے کی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ لیکن شمعی کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی اور وہ اسی طرح ساکت وصامت ایک جگہ بیٹھی رہ گئی، جس طرح لاکر بٹھادی گئی تھی۔

صبح ہوتے ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام پھیل گئی کہ وسیم نے اپنی زندگی کی سب سے حسین رات باہر باغ کے بنچ پر بیٹھے بیٹھے گزار دی ہے۔ گھر کے اندر ایک زلزلہ سا آیا اور سبھی افراد انگشت بدنداں رہ گئے۔ وہ وقت اور یہ وقت سارے لوگ حیران و پریشان تھے۔ یہاں تک کہ اس کی سسرال سے آئے ہوئے معزز مہمان تک حراساں تھے۔ بڑی بھابھی نے اس پر سوالوں کی بوچھار کر دی، مگر اس کی زبان خاموش رہی۔ ہر زبان پر صرف ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔ آخر کیوں وسیم اپنی ایک شب کی بیاہی دلہن کو طلاق دینے پر آمادہ ہے؟ بڑے بھیا کے سخت اصرار پر ان سے اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ مجھ سے اس فیصلے کی وجہ نہ پوچھو بھیا۔ کچھ راز ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان زندگی بھر اپنے آپ سے بھی چھپائے رکھتا ہے۔ تب انھوں نے بڑے ہی مطمئن انداز میں ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں شمعی کے بھائی سے کہا تھا۔

"برائے مہربانی آپ لوگ اپنی لڑکی کو اب یہاں سے ہمیشہ کے لیے لے جائیں۔ وسیم اسے طلاق کیوں دینا چاہتا ہے۔ میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہو سکتے۔" میں نے وسیم کی پرورش بطور باپ کے کی ہے اور اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں اور شمعی طلاق جیسے مکروہ الفاظ کا بوجھ اپنے وجود پر لیے ہوئے اس در سے اسی طرح واپس آ گئی جس طرح بابل کے گھر سے وداع ہو کر گئی تھی۔ اغیریہ جانے

ہوئے کہ اسے کون سے ناکردہ گناہوں کی یہ سزا دی گئی ہے۔

وسیم کو اپنے اصولوں سے بے حد پیار تھا۔ اسے اپنے کردار کی پختگی پر بڑا ناز تھا۔ اپنے ان ہی اصولوں کی خاطر اس نے سہاگ رات کی رنگینی کو قربان کر دیا تھا۔ جوانی کی سرحد میں قدم رکھنے کے بعد سے اب تک اس نے اپنے ذہن کو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا تھا۔ اپنے صاف ستھرے اور بے داغ کیریکٹر کے ساتھ ایک عزم، ایک جذبہ، ہمہ وقت اس کے پیش نظر رہا کرتا تھا کہ زندگی کے سارے ارمان اور چاہتیں صرف ایک ہی بار کسی ہستی کو سونپنے چاہیے۔

یونیورسٹی کی رنگین فضا میں اس کی شخصیت واحد تھی جس نے عشق ومحبت کی روایتی اور فرسودہ کڑی سے خود کو محفوظ رکھا تھا۔ اس کی خشک فطرت یونیورسٹی کی تمام شوخ وشنگ لڑکیوں کے لئے ایک چیلنج کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کے کلاس کی سب سے ہوشربا اور قیامت خیز لڑکی رعنا نے جب اس کے قریب آنے کی کوشش کی تو اس کے ایک ہی تلخ اور سنگین جملے نے اسے دوبارہ اس کے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ اس نے رعنا سے انتہائی چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''محترمہ! پہلے آپ اپنے مشرقی حجاب وحیا کے تقاضے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پھر کسی کے جذبات کا احترام کر سکیں گی۔ ہر طرف اس کا کیریکٹر ایک مثال کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔

شمعی کے جانے کے بعد گھر پر ایک افسردگی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ خود وسیم کو یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا یوں ممکن تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے ذہن پر پتھر کی ایک سل دھر دی گئی ہو۔ اپنی ذہنی کیفیت سے گھبرا کر وہ دالان کے سرے پر بچھی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کرسی کی پشت سے ٹک کر آسمان کی طرف نگاہیں گاڑ دیں۔

آسمان پر اس وقت آدھی رات کے تاروں کا سماں تھا۔ صبح ہونے میں کافی دیر تھی۔ ہر طرف سناٹے کی حکمرانی تھی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچا، کیا یہ تاریکی آج میرا مقدر

بن چکی ہے؟ پھولوں کی وہ بھینی بھینی مہک، وہ سناٹے، وہ تنہائی، جن کا وہ مدتوں سے خوگر تھا وہ یک لخت اس کے لیے نامانوس بن گئی تھیں۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر گھر کے افراد پر ڈالی۔ بڑے بھیا اور بھابھی غالباً سو چکے تھے۔ ان کی خوابگاہ کا دروازہ بند تھا اور پھولدار سا پردہ ساکت تھا۔ اس نے کلاک کی طرف نظر ڈالی، دو بجنے والے تھے، نہ جانے کیوں اس کے لبوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ بکھر گئی اور اس کا دل چاہنے لگا کہ بھیا اور بھابھی بغیر بتائے اس کی پریشانی اور اضطراب کا سبب جان لیں۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ بھابھی کو آوازیں دے کر جگائے اور ان سے کہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ جاگیں۔ مگر پھر وہ یہ سوچ کر رہ گیا کہ کسی کو اس کے دردِ نہاں کی کیا خبر؟ وہ اس کی بے چینی کا مداوا بھی کیا کر سکیں گی؟ اس عالم میں ایک سرد اور مضمحل سی سہ پہر اس کے دماغ کے اسکرین پر منعکس ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک عجیب سا واقعہ تھا جس سے اس کی زندگی کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اس شام اس کے قریبی دوست جمال نے اس کے سامنے سسکتے ہوئے اپنی محبوبہ کی بے وفائی کی داستان سنائی تھی۔ جمال کو ایک لڑکی سے بے پناہ محبت تھی۔ مگر اس لڑکی نے، اس کی محبت کو ٹھکرا کر دوسری جگہ شادی کی حامی بھر لی تھی۔ جمال نے اسے یہاں تک بتایا تھا کہ اس لڑکی نے اپنی محبت اور چاہت میں ہر دیوار کو گرا دیا تھا۔ ہر بندش کو توڑ کر پھینک دیا تھا، کسی سماجی حصار کی کوئی پروا نہ کی تھی۔

وسیم کے ذہن پر گزری یادیں آہستہ آہستہ دستک دے رہی تھیں اور اسے مزید یاد آ رہا تھا کہ وہ ایک شام جمال سے ملنے اس کے گھر گیا تھا، وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس لیے وہ واپس لوٹنا ہی چاہ رہا تھا کہ اچانک ہی سخت بارش شروع ہو گئی۔ اس نے بارش سے بچنے کے لیے جمال کی برساتی اوڑھ لی اور واپس آ گیا۔ گھر پہنچ کر جب اس نے برساتی اتارنی چاہی تو اتفاقیہ ہی اس کا ہاتھ برساتی کی جیب کے اندر چلا گیا اور ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں چلا آیا۔ اس نے غیر ارادی

طور پر لفافے کے اندر کا جائزہ لیا تو لفافے کے اندر سے ایک لڑکی کی پاسپورٹ سائز کی تصویر برآمد ہوئی۔ اس نے غور سے اس لڑکی کی تصویر کو دیکھا اور سوچا کہ جمال کی جیب میں سوائے اس کی محبوبہ کی تصویر کے اور کس کی تصویر ہو سکتی ہے۔ اس کی نگاہیں اس کے ہونٹوں پر جم کر رہ گئی تھیں جہاں ایک کالا تل صاف نظر آرہا تھا۔ اس خوبصورت تصویر کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ ابھری اور اس نے تصویر سے مخاطب ہو کر زیر لب کچھ کہا۔

پھر اس نے بے دلی سے وہ تصویر واپس جیب میں رکھ دی۔ برساتی جب اس نے جمال کو واپس کی تو اس تصویر کا ذکر کرنا کوئی ضروری نہ سمجھا۔ اور اب اسی لڑکی کو اپنی شریک زندگی کے روپ میں دیکھ کر اس کا وجود کسی آتش فشاں کی طرح بھڑک اٹھا تھا۔ وقت دبے پاؤں گزرتا گیا۔ شمعی کو طلاق دیے چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ مگر وسیم ذہنی طور پر خود کو دوسری شادی کے لیے آمادہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک دن اسے یہ بھی خبر ملی کہ شمعی کی شادی کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ ہوگئی اور وہ اسے لے کر جرمنی چلا گیا ہے۔

یہ خبر سن کر وسیم کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے سوچا کہ اس قسم کی لڑکیاں کتنی جلدی اپنا آشیانہ تبدیل کر لیتی ہیں۔ کچھ ماہ گزر جانے پر ایک دن اتفاقیہ وسیم کی ملاقات جمال سے ہوگئی۔ اس نے جمال سے پوچھا :

''کہو تمہاری محبوبہ کی کیا خبر ہے؟'' جمال نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا : ''ارے دوست! اسے محبوبہ نہ کہو، وہ اب میری بیوی ہے اور میرے پیارے گڈو کی ماں! ہم لوگوں کے درمیان کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی۔ پھر بات صاف ہونے پر ہم لوگوں کی شادی ہوگئی اور ہم لوگ اب مزے میں ہیں۔ وسیم نے دوبارہ سوال کیا :

''تو کیا شمعی نے دوبارہ تم سے شادی کر لی؟'' میں نے سنا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جرمنی چلی گئی۔'' جمال نے حیرت سے کہا ''کون شمعی؟ میری بیوی کا نام تو نازیہ ہے۔'' وسیم

نے زور دے کر کہا ''نہیں اس کا نام شمع ہی ہوگا۔'' جمال نے پھر کہا ''عجیب آدمی ہو یار تم بھی ارے بیوی میری ہے اور نام تم بتا رہے ہو؟''

وسیم نے دوبارہ کہا ''تو کیا تمہارے پاس جو تصویر تھی وہ نازیہ کی نہیں تھی؟'' جمال نے جواب دیا ''بالکل نہیں، نازیہ نے تو مجھے اپنی کبھی کوئی تصویر دی ہی نہیں تھی۔'' اتنا سن کر وسیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ اس کی نظروں کے سامنے زمین و آسمان دونوں ایک ساتھ گھوم رہے ہیں۔ اس نے بیٹھتے ہوئے دل کے ساتھ اس سے برساتی والی تصویر کا ذکر کیا تو جمال نے اپنے دماغ پر بہت زور دینے کے بعد کہا، ہاں یاد آیا۔ وہ تصویر میری بہن تارا کی کسی سہیلی کی تھی، جو تارا نے مجھے اس کے میٹرک کے فارم کے لیے صاف کروانے کو دی تھی۔'' اس کے بعد جمال نے کیا کہا، وسیم کچھ بھی نہ سن سکا۔ وہ تو ایک بت بن چکا تھا۔ پتھر کا ایک سخت بت، ہاں سخت، بالکل اپنے اصولوں کی طرح پتھر کی چٹان، جس سے ٹکرا کر اس کی اپنی ہی زندگی چکنا چور ہو چکی تھی، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی تھی اور اس میں اب پشیمانی کی بھی حس باقی نہ رہی تھی۔

☆☆☆

کون تھا اپنا کون پرایا

پروین کے ڈاکٹر بنتے ہی سلمیٰ بی بی کے دل کے اندر چاند سی بہو گھر میں لانے کی تمنا سر ابھارنے لگی تو وہ اپنی اس تمنا کی تکمیل کی خاطر لڑکی کی تلاش میں سرگرداں ہوگئی۔ بہت ہی تلاش اور جستجو کے بعد انہیں رعنا پسند آئی۔ رعنا سولہ سترہ سال کی ایک بیحد معقول سی لڑکی تھی۔ اس کے حسن کی دلآویزی دیکھنے والوں کو مسحور کر کے رکھ دیتی تھی۔ چنانچہ سلمیٰ بی بی کی دوربین نگاہوں نے رعنا کی تمام خوبیوں کو دیکھا پرکھا اور ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر انہوں نے اسے اپنی بہو بنالیا۔ مہکتی دمکتی شادی کی پہلی رات کو حجلۂ عروسی میں پرویز نے جب اس کا گھونگھٹ الٹا تو رعنا کی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی شراب نے اسے بے خود اور دیوانہ بنا دیا اور پھر اپنے دامن میں خوشبو کا ایک کارواں سمیٹے مہکتی ہوئی وہ رات تو گزر گئی مگر وہ پرویز کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے ایک خمار سا چھوڑ گئی۔

پرویز کی شادی کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ رات کے ایک بجے سکوت افزا سے ماحول میں اس کی کمرے کی فضا خوابناک بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے نرم و گرم مخملی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ رعنا اس کے

قریب لیٹی ہوئی مخروطی انگلیوں سے اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ کنگھی کر رہی تھی اور چمیلی کا نازک سا گجرا اس کے لمبے اور سیاہ بالوں سے لپٹا ہوا اپنی بھینی بھینی خوشبو سے پرویز کے دل و دماغ کو معطر کر رہا تھا۔ ایک کیف پرور اور مسرور افزا کیفیت سے ہم آہنگ ہوتا ہوا وہ نیند کی وادی میں کھونے ہی جا رہا تھا کہ اچانک ہی چاروں طرف سے آتی ہوئی چند بے ہنگم سی چیخ و پکار نے ان کے ہوش و حواس اڑا دیئے اور وہ گھبرا کر بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے، چیخ و پکار کی آوازیں بتدریج بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اُن دلخراش آوازوں سے زمین و آسمان ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ کانوں میں صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ بھاگو جلدی نکلو۔ کچھ لمحوں میں ہی یہ احساس ہوا کہ زہریلی گیس کی بو کے ساتھ کڑوی کسیلی گولیاں ان کی آنکھوں اور حلق کے راستے ان کے کلیجے کے اندر اترتی چلی جا رہی ہیں۔ فوراً ہی پرویز کے ذہن نے خطرے اور وقت کی نزاکت کا احساس کر لیا کہ گیس کی ٹنکی پھٹ جانے کی وجہ سے اس کالونی میں قیامت کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ چاروں طرف سے لوگ بیقراری کے ساتھ نکل نکل کر اس علاقے سے کسی محفوظ مقام پر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گیس پوری شدت کے ساتھ نتھنوں کے اندر گھستی چلی ہی جا رہی تھی اور پھیپھڑوں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ پرویز تیزی کے ساتھ رعنا کو لے کر کمرے سے باہر برآمدے میں نکل آیا۔ سامنے ہی برآمدے میں اس کا اسکوٹر کھڑا تھا۔ پلک جھپکنے میں اس نے رعنا کو اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ مگر وہ ابھی اسکوٹر اسٹارٹ بھی نہ کرنے پایا تھا کہ بجلی کی سرعت کے ساتھ ایک سوال اس کے ذہن میں اٹھ کھڑا ہوا۔ امی؟ اور اس خیال کے آتے ہی اس کی نظریں اس چارپائی کی طرف گئیں جہاں سلمیٰ بی بی بے سدھ پڑی تھیں۔ شاید زہریلی گیس کے اثر نے ان کے ہوش و حواس بالکل ہی گم کر دئے تھے۔ زہریلی گیس اب شدت اختیار کر چکی تھی اور اس نازک لمحے میں ایک سوال پرویز کے سامنے کسی خوفناک ناگ کی طرح پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا تھا کیونکہ اس ناگہانی آفت کے وقت اس کے سامنے دو زندگیاں تھیں۔ یہ دونوں ہی

زندگیاں بالکل بے بس تھیں۔ دونوں ہی اس کے سہارے کی محتاج تھیں۔ لیکن پرویز کا اسکوٹر صرف ایک ہی آدمی کو لے جاسکتا تھا۔ اس لئے اس کا دماغ کام نہیں کررہا تھا کہ ایسے نازک وقت میں وہ کیا کرے؟ لیکن یہ حقیقت تھی کہ اسے بہت جلد فیصلہ کرنا تھا کیونکہ ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور حلق میں چھالے سے پڑتے جارہے تھے۔ اسی جان لیوا مختصر سے لمحے میں ہی پرویز کی نگاہوں کے سامنے سلمٰی بی بی کا کمزور سا سراپا گردش کرنے لگا۔ سلمٰی بی بی جوگٹھیا کی مریض تھیں اور جنہوں نے بیوہ ہوجانے کے باوجود اس کی پرورش کچھ اس ڈھنگ سے کی تھی کہ اسے باپ کی کمی کا کبھی احساس تک نہ ہوسکا تھا۔ ان کی بیوہ زندگی کا صرف وہی ایک واحد سہارا تھا۔ ان کے تمام ارمانوں کا مرکز اور ان کی تشنہ تمناؤں کی تکمیل تھا۔ اور اب اس اچانک حادثے کے وقت فنا کے بھنور میں تھپیڑے کھاتی ہوئی ان کی زندگی اس کے دو مضبوط ہاتھوں کی محتاج تھی۔ اس وقت اس کے وہی دو ہاتھ انہیں موت کے منہ سے نکال سکتے تھے جن کی آبیاری انہوں نے اپنے خونِ جگر سے کی تھی۔ دنیا کی مخالف ہواؤں کے سامنے اسے ایک پیڑ بن کر سہارا دیا تھا اور دوسری طرف اس کی نئی نویلی دلہن تھی جس نے چند ہی لمحوں کی رفاقت میں اس کا دل اس طرح موہ لیا تھا جیسے وہ اس کی زندگی کی تکمیل تھی ورنہ اب تک تو وہ ادھوار انسان تھا۔ رعنا کے وجود میں اسے فردوس بریں کا لطف حاصل ہوا تھا اور ابھی تو وہ اس لطف سے پوری طرح سرشار بھی نہ ہونے پایا تھا۔ پھر اسی لمحے گزشتہ راتوں کے لمس کا احساس کرکے اس کے پورے جسم میں ایک لذت سی گھلنے لگی۔ اس نے بند ہوئی سانسوں کے درمیان رعنا کی طرف دیکھا جس کی دو بڑی بڑی بے حس نگاہیں آنسوؤں سے لبریز اس کی طرف رحم طلب نظروں تک رہی تھیں۔ بس اسی ایک لمحے میں اس نے رعنا کو بچانے کا فیصلہ کرلیا اور چشم زدن میں اس کا اسکوٹر اسٹارٹ ہوا اور اسے ایسا لگا کہ اس کا قوی ہیکل اسکوٹر اس کی نازک امی کے بدن کو کچلتا ہوا آندھی کی سی رفتار کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

سلمٰی بی بی کو جب ہوش آیا تو انہوں نے خود کو کسی مکان میں پایا جہاں وہ چارپائی پر لیٹی

تھیں اور انور ان کے سرہانے خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ ان کا سر دبا رہا تھا۔ ان کا ماؤف ذہن جب رفتہ رفتہ کام کرنے لگا تو انہیں یاد آیا کہ وہ اپنے گھر میں بستر پر سوئی تھیں کہ اچانک ہی انہیں اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہونے لگا۔ آنکھیں کھلتے ہی انھوں نے بستر سے اٹھ جانے کی پوری کوشش کی لیکن انہیں اپنا جسم بیکار ہوتا محسوس ہوا اور آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں مگر اپنی بند ہوئی آنکھوں سے انھوں نے اتنا ضرور دیکھا کہ ایک سایہ ان کی طرف تیزی سے بڑھا اور پھر دو مضبوط اور قوی ہاتھوں نے انہیں بستر پر سے گھسیٹ لیا۔ اس کے بعد انہیں کوئی ہوش نہ رہا اور اب ہوش آنے کے بعد انور کو اپنے سرہانے بیٹھا دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ چکی تھیں اور مارے احساس ندامت سے وہ اس سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی تھیں جو بار بار ان سے پوچھ رہا تھا، امی اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ سلمٰی بی بی انور کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکیں۔ صرف ایک بار آنکھیں کھول کر انہوں نے انور کے متفکر چہرے کی طرف دیکھا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی ان کا ہن دور کہیں ماضی کی وادیوں میں پرواز کر گیا۔

سلمٰی بی بی نے اپنی تیس سالہ شادی شدہ زندگی میں مصروف دو کام کیئے تھے۔ یک اپنی جائیداد سے محبت اور دوسرے انور سے نفرت۔ جائیداد سے محبت پرویز کی پیدائش کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ مگر انور سے نفرت اپنی جگہ بدستور قائم رہی تھی۔ سلمٰی بی بی دولت مند والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے سبب ان کی پوری جائیداد کی تنہا وارث تھیں۔ تیس سال قبل ان کی شادی نثار احمد سے ہوئی تھی۔ نثار احمد ان کی طرح دولت مند تو نہ تھے مگر وہ ایک نیک اور بے انتہا شریف انسان تھے۔ ان کی نیکی اور شرافت نے ہی سلمٰی بی بی کے والدین کا دل موہ لیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ بلا تامل ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ نثار احمد کی پہلی بیوی صالحہ فوت ہو چکی تھیں۔ انہیں صالحہ سے بے پناہ محبت رہی تھی۔ مگر صالحہ انور کو جنم دے کر موت کے آہنی پنجوں میں

ہمیشہ کے لئے اسیر ہوگئیں اور ان کی رفاقت کے وہ نادر ونایاب لمحے جو نثار احمد کی جان تھے وہ وقت کے خلاؤں میں کہیں روپوش ہوگئے۔ سلمٰی بی بی کے لئے جب انہیں ان کے والدین کا پیغام ملا تو انہوں نے اسے صالحہ کا بدل سمجھ کر قبول کرلیا۔ اس طرح سلمٰی بی بی کی ویران زندگی میں روشنی کی ایک شوخ کرن بن کر داخل ہوگئیں۔ نثار احمد کا خیال تھا کہ انہیں سلمٰی نثار احمد کی ذات میں اپنی کھولی ہوئی دنیا، یعنی صالحہ بیگم پھر مل جائیں گی۔ چنانچہ اپنے اس خیال کے زیر اثر انہوں نے سہاگ رات کی مہکتی ہوئی فضا میں سلمٰی کا گھونگھٹ اٹھا کر رونمائی میں ننھے منے انور کو ان کی گود میں ڈال دیا۔ اپنی سہاگ رات میں پہلی مرتبہ گھونگھٹ اٹھانے کے بعد جب سلمٰی بی بی نے بھاری بھرکم مردانہ وجود کے لمس کے بدلے دو ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس اپنے چہرے پر محسوس کیا تو نہ جانے کیوں یہ خیال اسی وقت ان کے دل میں جم کر رہ گیا کہ وہ حسین رات جو ہر انسان کی زندگی میں صرف ایک ہی بار آتی ہے اس کی شروعات ان کی زندگی میں ایک کڑوے زہر سے ہوئی ہے جو انہیں تمام عمر پینا پڑے گا۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی ان کے دل کے اندر اس معصوم کے لئے جو ان کے لال چمکیلے کپڑوں کو مسرت بھری نظروں سے تک رہا تھا اور ان میں ٹکے ستاروں کو اپنے ننھے ہاتھوں سے پکڑنے کی کوشش کررہا تھا، نفرت اور حقارت کے شرارے سے بھر گئے۔ اس نفرت کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا کہ اپنا گھونگھٹ کھینچ کر چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ ان کی اس ادا کو ان کے شوہر نے پہلی رات کی شرم وحیا تصور کیا۔ پھر رات کی رانی مدہوش کن فضا کی رہگزر سے گزرتے ہوئے اپنی حیا آلود پیکر کا ایک ایک پرت اتارتی چلی گئی۔ نثار احمد خوشبو کے سمندر میں اس رات ایسا غرق ہوئے کہ پھر انہیں ابھرنے کا ہوش ہی نہ رہا کیوں کہ انہیں ان کی گم شدہ جنت دوبارہ واپس مل چکی تھی۔ مگر انور جس کے لئے ماں کی ممتا کے سوتے خشک ہوگئے تھے وہ پھر کبھی سیراب نہ ہوسکے۔ کیونکہ شوہر کے گھر میں داخل

ہوتے ہی سلمیٰ بی بی کے دل کے اندر جو ماں بن جانے کے خیال کا نفرت زدہ بیج انور کے لئے پڑ گیا تھا وہ وقت کے ساتھ بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرتا چلا گیا اور سلمیٰ بی بی انور کے لئے بے جا ظلم و جبر و استبداد اور تشدد کا مرکز تھیں ۔ ان کے وجود کے اندر اٹھتی ہوئی نفرت اور حقارت کی تیز آندھیوں کی زد میں معصوم انور کی زندگی ایک بے حقیقت تنکے کی طرح ڈول رہی تھی ۔ انہوں نے اس کی ذات پر سوتیلی ماں کے تمام حربے استعمال کر ڈالے ۔ وہ ساری تکالیف انور کو دے ڈالیں جو سوتیلی ماں کی ذات کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں ۔ نثار احمد ان کی رفاقت میں چند سال گزارنے کے بعد اور اپنی ایک نشانی انھیں سونپ کر مالک حقیقی سے جا ملے اور شوہر کے انتقال کے بعد سلمیٰ بی بی اپنی من مانی کے لئے مکمل طور پر آزاد ہو گئیں ۔ وقت کا طائر پرواز کرتا رہا اور اس کی پرواز کے ساتھ ایک ہی گلشن میں ایک ہی پیڑ کی چھاؤں میں اور ایک ہی مالی کے ہاتھوں دو پودے بالآخر پروان چڑھ ہی گئے ۔ یہ بات اور تھی کہ گلشن کا ایک پودا مالی کے ایک ایک قطرہ خون کا ثمر تھا اور دوسرا اس کی بے توجہی کا شکار مگر آج وہ دونوں جوان تھے ، دونوں تندرست تھے اور دونوں ہی خوبصورت تھے ۔ قدرت کی اس ستم ظریفی کو کیا کیا جائے کہ انور اپنے اوپر ہونے والے تمام مظالم کو اس طرح خاموشی کے ساتھ جھیلتا چلا گیا جیسے ایک پتھر کی چٹان ، جس پر گزرنے والے کسی سرد و گرم کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ سلمیٰ بی بی کے زہریلے تیر و نشتر کو بغیر اپنی پیشانی پر ایک معمولی شکن لائے اپنی روح کی گہرائیوں میں سمیٹ لینا اس کی فطرت کا ایک حصہ بن چکا تھا ۔ سلمیٰ بی بی جتنا اس سے نفرت کرتیں وہ اتنا ہی ان سے محبت کرتا ۔ وہ جتنا اسے ٹھوکر لگاتیں وہ اتنا ہی ان کے قدموں میں جھکتا ۔ سلمیٰ بی بی کو اس کی یہی فرمانبرداری ایک تلخ زہر لگتی تھی ۔ اور آخر ایک دن وہ اس زہر سے اتنا پریشان ہوئیں کہ انہوں نے وکیل کے سامنے اپنا وصیت نامہ تیار کیا جس میں انہوں نے اپنی تمام جائیداد کا وارث پرویز کو بنایا ۔

گھر کے ایک تنکے تک کا حقدار انور نہ تھا اور اس کے بعد انہوں نے پرویز جو کہ انور سے
چھوٹا تھا اس کی شادی انور سے پہلے کردی اور اب وہی سلمٰی بی بی انور سے آنکھ نہیں ملا پارہی
تھیں جو بار بار ان سے یہی پوچھ رہا تھا امی اب آپ بالکل ٹھیک تو ہیں۔ ان کی طبیعت
جب کچھ سنبھلی تو انور انہیں اپنے ساتھ لے کر گھر آیا، جہاں پرویز اور اس کی دلہن شرمندہ
شرمندہ سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ سلمٰی بی بی کے رویے میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔
ہاں ایک دن انہوں نے خاموشی کے ساتھ اپنا وصیت نامہ نکالا اور اس میں پرویز کا نام
ہٹا کر انور کا نام لکھ دیا۔

☆☆☆

تہی داماں

سہانی سی ایک خوشگوار شام کو شرمین جب دلہن بنی تو دیکھنے والوں کی نگاہیں اس کے بے پناہ حسن میں کھو کر رہ گئیں۔ اس کے خوبصورت رخسار دہک رہے تھے۔ ہونٹوں کی سرخی میں مسکراہٹ رچی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو اس کی دلی خوشی کا پتہ دے رہی تھی۔ پھولوں سے لدی ہوئی کار میں وہ سسرال آئی۔ سسرال کا مکان بقع نور بنا ہوا تھا۔ باہری گیٹ سے حماد کے کمرے تک اسے پھولوں پر چلاتے ہوئے لایا گیا۔ تنہائی ملتے ہی اس نے آہستہ سے نگاہیں اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ پورا کمرہ ہلکی گلابی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ دروازوں پر گہرے گلابی رنگ کے پردے لٹک رہے تھے اور ان سے میچ کرتا ہوا دبیز قالین زمین پر بچھا ہوا تھا۔ نفاست سے سجائے ہوئے کمرے میں اس کی ساری تھکن دور ہوگئی اور ایک طمانیت کے احساس سے اس کی آنکھیں مند گئیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد حماد کمرے کے اندر داخل ہوا تو اس نے آنکھیں کھول کر گھونگھٹ کی اوٹ سے اسے دیکھا۔ شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں وہ کوئی

آ ناقی شہزادہ لگ رہا تھا۔ ہونٹوں پر ایک دلنشیں مسکراہٹ سجائے۔ وہ اس کے بہت ہی قریب بیٹھ گیا اور پھر آہستہ سے کہا ''شرمین تمہیں اس روپ میں پانے کے لیے میں نے ایک ایک لمحہ گن کر گزارا ہے۔ تم میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہو۔'' اتنا کہہ کر اس نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

جسموں کے اتصال کی تمنا ابھی تکمیل تک بھی نہ پہنچی تھی کہ اچانک ہی شرمین واحدی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ نیند سے بیدار ہو گئیں اور ان کے حسین خواہشات و خیالات کی سجی سجائی دنیا لمحہ بھر میں ہی درہم برہم ہو گئی۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی ان کے کانوں میں گھڑی کی بے رحم ٹک ٹک اور سیلنگ فین کی گھنگھناہٹ سنائی دی۔ بستر پر لیٹے ہی لیٹے انہوں نے اپنے تنہا کمرے کے درودیوار پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ ابھی ابھی انہوں نے خواب میں حماد کو دیکھا تھا۔ حماد ان کا کلاس فیلو تھا جس سے انہوں نے تعلیمی دور میں بے پناہ محبت کی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی حماد کے تصور میں کھوئی تھیں کہ اذان صبح کی آواز فضاء میں گونجنے لگی۔ انہوں نے بستر سے اٹھ کر وضو کیا اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد کافی دیر تک کلامِ پاک کی تلاوت کرتی رہیں۔ تقریباً نو بجے وہ کلام پاک بند کر کے اٹھنا ہی چاہ رہی تھیں کہ خادمہ چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی۔ چائے پیتے ہوئے انہوں نے خادمہ کو صبح کے ناشتے اور دن کے کھانے کی ہدایت دی اور اس کے جانے کے بعد کمرے سے نکل کر باغیچے میں چلی گئیں۔ باغیچے میں رنگارنگ پھولوں کے درمیان انہیں کچھ فرحت کا احساس ہوا تو وہ وہیں ہری ہری گھاس پر بیٹھ گئیں۔

صرف ایک ماہ کے بعد وہ اپنی سروس سے ریٹائر کرنے والی تھیں اس لیے انہیں یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا خالی وقت کس طرح کٹے گا؟ اس سوال کے جواب کے لیے وہ نہ جانے کب تک اپنے خیالات سے الجھتی رہیں۔ جب کوئی سرا ان کے ہاتھ نہ آیا تو وہ واپس اپنے کمرے میں چلی آئیں اور کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر دودھیا آسمان کی طرف

دیکھتے ہوئے سوچنے لگیں کہ دوسروں کو انتہائی کامیاب نظر آنے والی ان کی یہ زندگی شاید یہاں سے وہاں تک پچھتاوا ہی پچھتاوا ہے، مگر کیا اپنی اس بے رنگ پیاسی اور تشنہ زندگی کی وہ خود ذمہ دار ہیں۔ کیا اس تنہا زندگی کے حصول کے لیے انہوں نے محبت کی نعمت کو حقیر سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا۔ حماد سے ناطہ توڑ لیا تھا۔ صرف اس دن کے لیے جہاں تنہائیاں ہیں۔ بے رنگ سی پھیکی پھیکی تنہائیاں۔ آج انہیں اس بات کا بہت ہی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی کی زندگی سے وابستہ نہیں ہیں۔ کوئی ان کی زندگی کا شریک نہیں ہے۔ ایک ماہ بعد جب وہ اپنی اس اونچی سروس سے ریٹائر کر جائیں گی تو پھر کیا کریں گی۔ وہ مزید سوچتیں کہ میری خواہش تھی کہ اسلامی روش کے ساتھ چلتے ہوئے تعلیم حاصل کروں اور ایک اعلیٰ عہدہ نصیب ہو۔ پروردگار نے یہ تمنا پوری کی۔ پھر دل کے اندر ایک تشنگی کا احساس کیوں باقی ہے۔ شاید اس لیے کہ انسانی زندگی کی کچھ جسمانی ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ ایک ایسی زندگی بھی ہوتی ہے جس میں ایک بھرا پرا گھر ہوتا ہے۔ ایک ساتھی ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ مگر میرے پاس تو یہ سب کچھ بھی نہیں۔ کیا میں نے وقت سے شکست کھا کر ایک انتہائی ناکام زندگی حاصل کی ہے۔

دودھیا آسمان پر نظریں جمائے وہ کھوئی کھوئی سی کھڑی تھیں کہ دفتر جانے کا وقت آ گیا اور وہ غسل خانے کی طرف چلی گئیں۔ ان کے تیار ہوتے ہی ڈرائیور نے گیراج سے کار نکالی اور ردا اوڑھ کر دفتر کے لیے روانہ ہو گئیں۔

بہت سال قبل جب ثمرین کا داخلہ انٹر میں ہوا تھا تو اس وقت وہ بہت حسین تھیں۔ سرو قد، نازک اندام، گندمی رنگ، بے حد جاذب نظر نقش و نگار، لمبے لمبے سیاہ بال جنہیں وہ نماز پڑھنے کے انداز میں ہر وقت دوپٹے سے ڈھانپے رہتی تھیں۔ انہیں مذہب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ بہت ہی بچپن میں انہوں نے کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ پانچ وقتوں کی نمازیں انتہائی پابندی سے ادا کرتیں اور کہیں باہر جانا ہوتا تو بغیر برقع اوڑھے کبھی نہیں نکلتیں۔ مذہب سے ان کا یہ گہرا لگاؤ دیکھ کر لوگ

انہیں دقیانوسی کہتے تھے جسے سن کر اندرونی طور پر انہیں سخت تکلیف ہوتی تھی۔

کالج کے تعلیمی سفر کے دوران انہیں حماد سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ انہیں بہت اچھا لگا تھا۔ سوبر سا انتہائی خوش شکل۔ محبت تو عطیۂ خداوندی ہے، کائنات کا سب سے حسین تحفہ، ایک انمول نعمت۔ اس لیے وہ بھی اپنے دل کے اندر محبت کا ایک نرم گوشہ رکھتی تھیں اور حماد کے لیے ان کے دل کے اندر بے پناہ پیار امنڈ آیا تھا۔ محبت کے پاک جذبے کو عبادت کا درجہ دے کر وہ سوچتی تھیں کہ حماد میری زندگی کی تکمیل ہے۔ میری دلی تمنا ہے۔ اس تمنا کے حصول کے لیے وہ ہر ہر نماز میں گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگتی تھیں مگر یہ ان کا کردار تھا کہ اتنی شدید محبت اور چاہت کے باوجود انہوں نے کبھی بھی حماد کو اپنی حد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتی تھیں جو ان کے ایمان کے خلاف ان کے قدم ڈگمگا دے۔ محبت کے نام پر اپنے اصولوں کی قربانی دے کر وہ بک جانے کی قائل نہیں تھیں۔ حماد سے ملاقاتوں کے درمیان رفتہ رفتہ انہیں اس بات کا احساس ہونے لگا کہ حماد ان کی راہیں کھوٹی کرنا چاہتا ہے۔ محبت کی آڑ لے کر انہیں شاہراہ سے ہٹانے کی سعی کر رہا ہے۔ باتوں کے دوران اکثر موقع پا کر وہ ان سے کہتا تھا۔ ''شرمین مجھے یہ لمبے بال پسند نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں کٹوا کر نیو ہیئر اسٹائل میں تبدیل کر لو تو تمہاری خوبصورتی میں چار چاند لگ جائیں گے اور تمہارا دوپٹہ اوڑھنے کا یہ انداز تو بالکل ہی بھونڈا ہے۔ اچھی بھلی شکل بگاڑ کر رکھ ڈالی ہے تم نے۔ جانتی ہو جب یہ نقاب کا لبادہ اوڑھ کر تم کالج آتی ہو تو کس قدر مذاق کا موضوع بنتی ہو۔ ساتھیوں کی تنقیدی باتیں سن سن کر میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وقت آنے پر تمہارے خیالات میں بھی تبدیلی آنا لازمی ہے۔ ہماری شادی ہو جانے کے بعد جب تم کلب جوائن کر دگی تو آہستہ آہستہ یہ تمام حصار ٹوٹ کر خود بخود بکھر جائیں گے۔ اس لیے شرمین تمہیں کم از کم ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ اس زمانے میں عورت کو نہ صرف یہ کہ محض دنیا کا ہو کر رہ جانا چاہیے اور نہ ہی بالکل راہبہ بن جانا چاہیے۔ دنیا داری اور دنیا سے بالکل

کنارہ کشی یہ دونوں ہی چیزیں انسان کے لیے مضر ہیں۔ اس لیے اس اعتدال کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے۔ اتنا تو تم جانتی ہی ہوگی کہ اسلام بھی میانہ روی کو پسند کرتا ہے۔ آج کے دور میں تم نے جو راہ اختیار کر رکھی ہے وہ دقیانوسی کے سوائے کچھ بھی نہیں ہے۔ حماد کے یہ خیالات جان کر وہ ذہنی طور پر پریشان سی ہو جاتیں۔ ان کے دل کے اندر ایک ہوک سی اٹھتی اور انہیں اپنے ابو کی وہ نصیحت یاد آ جاتی جو انہوں نے کالج میں داخلہ لینے کے بعد انہیں کی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ نسوانی پندار کا ہر دم خیال رکھنا، حیا اور شرم کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا اور اپنی ذات کی توہین نہ ہونے دینا، کیونکہ عورت کی عریانیت ان کی شخصیت پر ایک بدنما داغ ہوتی ہے۔ اس نصیحت کے تحت وہ سوچتیں کہ یہ اسلام کے پیروکار ہیں جو رسول اکرمؐ کے بنائے ہوئے دین کے راستے پر چلنے کو دقیانوسیت مانتے ہیں۔ کس قدر افسوس اور بدبختی کی بات ہے کہ مسلمان کہلانے والے خود مسلمانوں کے کرداروں کو مجروح کر رہے ہیں۔ ایسی تعلیم اور ترقی کس کام کی جو ہمیں اسلام سے دور کر دے، ہمارے مذہبی اور قومی تشخص کو ہم سے چھین لے۔ شاید یہ مردوں کے ان ناقص نظریات ہی کا قصور ہے کہ آج کے دور میں عورتیں اپنے اس مقام کو بھول بیٹھی ہیں جو خدا نے انہیں عطا کیا تھا۔ مغربیت کی تقلید میں وہ عریاں بھی ہو رہی ہیں۔ بے حیائی اور بے شرمی کا پیکر بھی بن رہی ہیں۔ نام نہاد آزادی کا نام لے کر والدین کے خلاف بغاوت کر رہی ہیں اور انہیں ذلیل و رسوا بھی کر رہی ہیں۔ اپنی ترقی کی تلاش میں وہ ان حقوق کی خاطر جدوجہد کر رہی ہیں جو انہیں اسلامی شاہراہ سے دور کرتی جا رہی ہیں۔ نہ جانے اس ترقی کی انتہا کیا ہوگی۔ شاید یہ کہ اس کوشش میں وہ اپنا وہ مقام کھو دے گی جو مشرقیت کا تقاضہ ہے۔

چنانچہ انہوں نے حماد کے نظریات کو دل میں جگہ نہ دے کر یہ مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اسلام کے اصولوں کے آگے کسی ترقی پسندی کو بھی ترجیح نہیں دیں گی، کسی رشتے کو، کسی لگاؤ کو اس پر حاوی ہونے نہیں دیں گی۔ اسلامی اصولوں پر سختی سے کاربند ہونے کے ساتھ ان کے کچھ دنیاوی

عزائم وارادے بھی تھے۔ ان کی یہ دیرینہ تمنا تھی کہ مذہب وشریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے وہ خودکفیل ہوں۔ اس لیے وہ اپنی صلاحیت کے بل پر ایک اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے کی متمنی تھیں۔

اپنے عزم وارادے اور اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ حماد سے دور ہونے لگیں۔ اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ مگر حماد بار بار ان کے راستے میں حائل ہوکر پیار کا ہاتھ بڑھانے کی کوشش کرتا اور وہ اس ہاتھ کو بہت ہی سختی سے دور جھٹک دیتیں کیونکہ انہیں اس بات کا کامل یقین تھا کہ یہ ہاتھ انہیں سہارا تو نہیں دیں گے، ہاں ایک خوفناک دلدل میں ضرور دھکیل دیں گے۔ اس دلدل میں دھنس کر وہ اپنی پیاری اور آفاقی تہذیب سے دور ہوجائیں گی۔ ان کی اپنی شخصیت، اپنی پہچان بکھر جائے گی۔ وہ مغربیت کے لباس میں روپوش ہوجائیں گی اور ان کا ایک اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے کا خواب ٹوٹ جائے گا۔ اس خیال کے تحت انہوں نے اپنی محبت کی قربانی دے دی اور حماد سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کرلی۔ یہ سوچ کر کہ حماد ان کے اصولوں اور کیریئر سے برتر نہیں ہے کہ میں اس کی خاطر اپنی انفرادیت کی قربانی دے دوں۔ محبت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ ایک ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ذہنی ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو پھر زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ اور میں نے ایسی زندگی کی خواہش نہیں کی ہے جہاں بے راہ روی ہو، تلخ کلامی، غصہ، نفرت اور جھنجھلاہٹ ہو۔

اس کے بعد بھی حماد نے انہیں پگھلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ طرح طرح کے دلائل سے قائل کرنا چاہا کہ انسان کی زندگی خدا نے تنہا رہنے کے لیے پیدا نہیں کی ہے۔ زندگی میں اگر ایک ساتھی نہ ہوتو زندہ رہنے کا لطف ہی نہیں۔ ایک محدود دنیا سے نکل کر اپنی ہستی کو کسی دوسری ہستی میں گم کرکے دیکھو تو تمہیں خود ہی احساس ہوجائے گا کہ تم زندگی کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہو۔ تمہارے خیالات اور نظریات ایک دن تمہیں اس مقام پر پہنچادیں گے جہاں سے

پلٹ کر واپس آنا تمہارے لیے ممکن نہ ہوگا۔ کوئی بھی انسان فطرت کو بدل نہیں سکتا۔ اگر تم فطری جبلتوں کے خلاف اپنی شخصیت کو ڈھالنے میں کسی طرح کامیاب ہو بھی گئیں تو یہ خود تمہارا اپنے آپ پر سب سے بڑا ظلم ہوگا۔ شرمین تم اپنی ضد چھوڑ کر میری ہو جاؤ پھر دیکھنا کہ میرا قرب پا کر تمہیں کسی محرومی کا احساس نہ ہوگا۔

اتنا کہہ کر حماد نے ان کے آگے بھیک کی طرح جھولی پھیلا دی تھی۔ اس وقت وہ کچھ دیر تک اس پھیلی ہوئی جھولی کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔ شاید اس وقت کوئی کمزور لمحہ بھی ان کے دل کو جھنجھوڑ گیا ہوگا مگر انہوں نے اسے خود پر حاوی ہونے نہیں دیا تھا۔ حماد کی دلیلیں ان کے عزم و ارادے کو ڈگمگا نہ سکیں اور انہوں نے کہہ دیا ''حماد تمہارے نظریات مجھے میرے نصب العین سے بہت دور کر دیں گے۔ یہ سن کر حماد نے اپنا پھیلا ہوا دامن گرا دیا تھا اور کہا تھا ''شرمین ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب تمہیں اپنے نصب العین پر پچھتانا پڑے گا۔ مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ انہوں نے اس کی دلیل کو بھی ان سنی کر دیا اور خود کو بے اعتنائی اور بے رخی کے مضبوط قلعے میں قید کر لیا۔ حماد نے اس قلعے کی دیوار توڑنے کی بار بار کوشش کی اور جب اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تو ان کے اصولوں اور نظریات سے علیٰحدہ ہو کر کسی دوسرے راستے پر آگے بڑھ گیا اور وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد میں مصروف ہو گئیں۔ ایم۔ ایس۔ سی کر کے کالج میں لکچرر ہو گئیں۔ پھر سلیکشن کا امتحان دے کر انکم ٹیکس کمشنر کے عہدے پر پہنچ گئیں۔ اس کرسی تک پہنچتے پہنچتے ان میں بس اتنی ہی تبدیلی آئی تھی کہ برقع کی جگہ ایک ہلکی ردا نے لے لی تھی جسے وہ جب تک باہر ہوتیں اوڑھے رہتیں اور بس وہ اپنے تمام اصولوں پر اسی طرح قائم تھیں۔ وقت نے ان کے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ان کے چہرے پر ایک پرنور سادگی اور علم کی رونق پیدا کر دی تھی۔

ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ یہاں تک کہ ان کی سروس کا وقت بھی ختم ہو گیا اور اب زندگی کے اس دور میں آ کر اکثر انہیں خیال آتا تھا کہ ان کا فیصلہ غلط تھا یا صحیح۔ چھٹیوں میں ان کے بھائی

بہن اپنے بچوں کے ساتھ ان کے یہاں آجایا کرتے تھے۔ اس وقت انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ مگر ان کے جانے کے بعد جب وہ پھر تنہا ہو جاتیں تو انہیں احساس ہونے لگتا کہ ان کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں ایک تشنگی باقی رہ گئی ہے۔ اسی تشنگی کے احساس کو انہوں نے آج خواب کی شکل میں دیکھا تھا۔ اس وقت سے وہ مسلسل کھوئی کھوئی اور پریشان سی تھیں۔

دفتر سے واپسی کے لیے جب وہ کار پر بیٹھیں تو راستے میں انہیں خیال آیا کہ حماد بھی تو کافی دنوں سے اپنی فیملی کے ساتھ اسی شہر میں رہتا ہے۔ ایک شہر میں رہنے کے باوجود وہ حماد سے نہیں ملتی تھیں اور نہ ہی کبھی اس کے گھر گئی تھیں۔ آج نہ جانے کیوں ان کا دل خود بخود چاہنے لگا کہ حماد کے گھر جائیں۔ اس کی بیوی اور بچوں سے ملیں۔ اس کی آج کی زندگی کو دیکھیں۔ اپنی موجودہ زندگی سے اس کی موجودہ زندگی کا موازنہ کریں۔ اتنا سوچ کر انہوں نے کار کا رخ حماد کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ وہ کہاں رہتا ہے اور اس کا گھر کس جگہ پر ہے، یہ ان کے علم میں تھا۔ دل کے اندر ایک نامعلوم سی کیفیت کا احساس لیے وہ بالآخر حماد کے گھر کے پاس آکر رک گئیں۔ ان کے ذہن کے اندر اس کے گھر کا دھیما دھیما اور متوازن سے ماحول کا تصور تھا۔ ہر چیز میں ایک طرح کی ترتیب قرینہ نظم وضبط اور سلیقے کی جھلک نمایاں۔ ایک ایسی کشش جو پہلی نظر میں ہی دیکھنے والوں کو متاثر کردے۔ وہ جیسے جیسے قدم آگے بڑھاتی گئیں انہیں ایک قسم کی اپنائیت کا احساس ہوتا گیا جیسے کوئی ان کے رستے ہوئے زخموں پر مرہم کے پھاہے رکھ رہا ہو۔ جذبات کو سنبھالنا کبھی کبھی کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے دل کے اندر ایک نامعلوم سا طوفان اٹھ رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھیں کہ دل تو محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے، پھر یہ طوفان کہاں سے اٹھتا ہے جو انسان کی پوری شخصیت کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ دل بار بار یہ آواز کیوں دے رہا ہے کہ اس گھر کے اندر رہنے والے ایک وجود سے میرا واسطہ ہے۔ عمر کی دھوپ میں پگھل کر جسموں کی جگمگاہٹ ماند پڑ جانے سے روحوں کے رشتے مٹا نہیں کرتے، پھر ان کا ہاتھ کال بیل پر چلا گیا۔ گھنٹی بجاتے

وقت انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی تقدیر کے بند دروازے پر دستک دے رہی ہوں۔ان کا ہاتھ بیل پر تھا اور ذہن کے پردے پر گھر کے اندر کا منظر ابھر رہا تھا۔ پرکشش اور عمر کے لحاظ سے باوقار حماد میز پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی سنجیدہ لڑکیاں اور اچھے پوسٹ پر کام کرنے والے مہذب لڑکے۔

دروازہ کھلا اور انہوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے ناگفتہ بہ حالت میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت کھڑی ہے۔اسے انہوں نے گھر کی ملازمہ سمجھ کر اس سے سوال کیا ''کیا مسز حماد تشریف رکھتی ہیں؟'' اس عورت نے جواب دیا ''فرمایئے کیا کام ہے، میں ہی مسز حماد ہوں۔'' یہ سنتے ہی لمحہ بھر میں ان کی نظروں کے سامنے سے وہ سارے نقوش غائب ہو گئے اور وہ اس عورت کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہوئیں۔وہ ایک ایسا گھر تھا جہاں آسودگی اور خوش حالی کا مدھم سا نشان تک نہ تھا۔ خستہ دیواریں اور بے ہنگم سے سامان بکھرے پڑے تھے۔ایک طرف ٹوٹی چوکی پر پرانی سی مشین رکھی تھی جس کے اردگرد مختلف رنگوں کے کپڑے پڑے تھے۔ایک کپڑا مشین میں لگا ہوا تھا جسے دیکھ کر انہیں یہ قیاس لگانے میں دیر نہیں لگی کہ غالباً وہ کپڑا سی رہی تھیں جسے چھوڑ کر اٹھ گئی تھیں۔اس گھر میں ایک عجیب سی تنہائی تھی۔

شمرین واحدی نے ان کے قریب رکھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے آغاز گفتگو کیا ''میں حماد کی کلاس فیلو ہوں اور ایک عرصہ کے بعد یہاں آنے کا اتفاق ہوا ہے۔'' حماد اور بچوں کے متعلق پوچھنے پر مسز حماد کی آنکھیں چھلک اٹھیں اور انہوں نے بیان کرنا شروع کیا ''میں نے جس شوہر اور بچوں کی زندگی کو سنوارنے اور سجانے میں اپنی جوانی گزار دی، وقت نکل جانے پر اب انہوں نے ہی زندگی کے اس دور میں مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ میرے دو بیٹے، ایک ڈاکٹر اور ایک انجینئر، دونوں نے ہی اپنی پسند سے اینگلو انڈین لڑکیوں سے شادی کر لی اور امریکہ جا بسے۔ بڑی لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ افریقہ چلی گئی۔وہاں اس کے شوہر نے اپنا کاروبار اس طرح پھیلا

لیا ہے کہ اسے اب یہاں آنے کی فرصت ہی نہیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی نے ایم۔اے کے امتحان میں ٹاپ کیا اور شادی ہو جانے کے بعد لندن کی ایک یونیورسٹی میں اپنے شوہر کے ساتھ ریسرچ کر رہی ہے۔ سب سے چھوٹا لڑکا جس کی شادی ہم نے کی تھی وہ بنگلور میں ہے۔ حماد کلکٹر کے عہدے پر تھے۔ انہوں نے کافی پیسہ حاصل کیا۔ ان کے مزاج میں رنگینی پہلے ہی سے تھی۔ دولت اور عہدہ حاصل ہو جانے کے بعد انہوں نے گھر سے لاپرواہی برت کر خود کو آوارہ لڑکیوں، کلب اور شراب میں گم کر دیا۔ گھر کے بگڑے ماحول کا بچوں پر اثر پڑا اور انہوں نے اپنی من مانی شروع کر دی۔ نتیجے میں گھر کی حالت شکستہ ہوتی چلی گئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد حماد کو پروویڈینٹ فنڈ کی رقم ملی تھی۔ اس رقم کی لالچ میں چھوٹی بہو نے اپنی خدمت گزاری اور چکنی چپڑی باتوں کا ان پر ایسا جال پھینکا کہ انہوں نے میری بالکل پرواہ ہی چھوڑ دی۔ اور مجھے مفلسی کی اس حالت میں پہنچا کر بیٹے اور بہو کے ساتھ رہنے کے لیے بنگلور چلے گئے۔ اب میں بالکل بے سہارا ہوں۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف اللہ میرا مددگار ہے۔ سلائی کا تھوڑا بہت ہنر جانتی تھی جس کے سہارے اس تنہا مکان میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں۔

اپنی دکھ بھری کہانی سناتے سناتے مسز حماد پھوٹ کر رو پڑیں۔ شرمین مسز حماد کی تنہائیوں اور محرومیوں کی داستان بہت غور سے سن رہی تھیں۔ یہ سب سنتے ہوئے انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی سوچ کے دھاروں کو ان کے ذہن کی لہروں کے ساتھ مسلسل ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کا ذہن مسز حماد کے ذہن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ان کے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہی انہوں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں دلاسہ دیا اور بہت ہی نرمی سے دھیمے دھیمے خواب آلود لہجے میں کہا ''مسز حماد آپ نے بہت اچھا کیا کہ مجھے سب کچھ بتا دیا۔ محرومیوں میں اگر کسی کو شریک کر لیا جائے تو ان کے زہر کی کاٹ کسی قدر کم ہو جاتی ہے۔'' انہوں نے مزید باتوں کے بعد مسز حماد کو بتایا کہ ان کی اپنی زندگی بھی کس قدر بے کیف، پھیکی اور بے

رنگ ونور ہے۔ وہ بھی ان کی طرح بالکل اکیلی اور تنہا ہیں۔ ان کا بھی کوئی رفیق اور ساتھی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے پیشے اور کام کو ہی اپنی زندگی اور خون کے آنسو رلانے والے احساس کی شدت کو کم کرنے کے لیے عبادات الٰہی کا سہارا لیا ہے۔ وہ مسز حماد کی ناکام زندگی کی داستان سن کر خود کو کچھ ہلکا محسوس کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی نہ جانے کیوں انہیں ان سے ہمدردی سی محسوس ہو رہی تھی۔ انہیں لگ رہا تھا کہ جیسے مسز حماد نے انہیں اپنی محرومیوں سے آگاہ کر کے ان کے اندر کی بھڑکی ہوئی آگ کو بڑی حد تک ٹھنڈا کر دیا ہو۔ انہیں یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ ایک ہلکی نیند سے بیدار ہوئی ہوں اور جاگتے ہی انہوں نے اپنے وجود کے گرد بنے ہوئے بہت سے پرانے جالوں کو یکا یک ختم کر دیا ہو۔

وہ اپنے گھر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی۔ کار تارکول کی چکنی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور وہ اپنے دل میں اس پروردگار کا شکر ادا کر رہی تھیں جس نے انہیں نیک عمل کے راستے پر چلنے کی تلقین کی تھی۔ گھر آ کر انہوں نے مغرب کی نماز ادا کی۔ خادمہ نے آ کر جب ان سے رات کے کھانے کی ہدایت طلب کی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے پسندیدہ کھانوں سے متعلق ہدایت دی اور دل میں سوچنے لگیں، مجھ میں اور مسز حماد میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ زندگی میں سب کچھ حاصل ہونے کے بعد بھی آج وہ تہی داماں ہیں اور میں مسز حماد نہ بن کر مسز حماد سے زیادہ مضبوط ہوں۔

☆☆☆

ڈوبتی شام

موسم سرما کا سہانا سا دن ہے۔ ہر طرف سنہری دھوپ نکھری ہوئی ہے۔ آج میں نے کالج سے ایک دن کی فرصت لے لی ہے کیونکہ مجھے شمو کا سوئٹر مکمل کرنا ہے۔ احمد کے فیکٹری جاتے ہی میں نے ایزی چیئر لان میں ڈال لی ہے اور سوئٹر مکمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ایزی چیئر موسم سرما کے قبل ہی احمد نے میرے لیے خریدی تھی۔ جاپانی تاروں سے بنی ہوئی یہ کرسی بڑی ہی نفیس اور دلکش ہے۔ احمد چونکہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جاڑے کی سنہری دھوپ میں گلاب کے پودوں کے درمیان بیٹھ کر سوئٹر بننا میرا محبوب مشغلہ ہے اس وجہ سے انھوں نے یہ گارڈن چیئر خریدی تھی۔

شمو کے پاس تو پہلے ہی سے درجنوں سوئٹر ہیں پھر بھی کل جب وہ میرے لیے یہ براؤن شال لائے تو اس کے ساتھ ہی یہ ڈھیر سارا اون بھی خرید لائے۔ جب میں نے کہا کہ ابھی تو کافی سوئٹر پڑے ہیں تو انھوں نے مسکرا کر جواب دیا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے ڈیر، اس موسم میں نرم و گرم اون سے سلائیوں کے سہارے بنائی کرنا اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ ان کے اس

جواب پر میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ انھیں ہم لوگوں کے آرام و آسائش کے خیال کا ایک جنون سا سوار رہتا ہے۔

ہماری خوشیوں اور آسائشوں کے لیے اپنی جان نچھاور کرنے والے احمد جو ایسے فرشتہ صفت ہیں کہ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید خدا نے میرے کسی نیک عمل کے بدلے میں مجھے ان کے جیسا شوہر عطا کیا ہے۔ اگر احمد جیسا شریکِ حیات مجھے نہ ملا ہوتا تو شاید میری شخصیت اب تک ٹوٹ کر بکھر چکی ہوتی۔ کیونکہ حالات سے سمجھوتہ کر لینا میری فطرت کبھی نہیں رہی۔ اور جب حالات موافق نہیں ہوتے تو شخصیت مر جاتی ہے اور جب انسان کی اپنی شخصیت مر جاتی ہے تو انسان خود بھی مر جاتا ہے۔

ہماری شادی کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن ان کے معمول میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ازدواجی زندگی کا پودا وہ پودا ہے جسے دو محبت بھرے ہاتھ مل کر لگاتے ہیں۔ اس لیے انھیں چاہیے کہ وہ اپنی عقل و دانش سے اس کی اس طرح آبیاری کریں کہ زمانے کے سرد و گرم اس پر کبھی بھی اثر انداز نہ ہو پائیں۔ کیونکہ خدا کی عطا کردہ یہ کائنات بے حد حسین ہے اور اس میں بسنے والے وہ لوگ انتہائی قابلِ احترام ہیں جو اسے اپنے حسنِ عمل سے سجانے اور خوشگوار رکھنے کی سعی میں لگے رہتے ہیں۔ ایک دن احمد مجھے اپنے ساتھ اپنی فیکٹری کی سالانہ میٹنگ میں لے گئے تھے۔ اپنے تمام ورکروں کے درمیان وہ ایک پرنس نظر آرہے تھے۔ اس دن مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ اپنے ورکروں میں ہر دل عزیز ہیں۔ اپنی تقریر کے دوران انھوں نے کہا تھا کہ ہم انسانوں کے اندر سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ہم اپنی فہم و فراست، عقل و دانش اور رفتار و گفتار کو تو ساری دنیا سے اہم سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اندر اپنے فرسودہ رسم و رواج کے دائرے کو توڑنے کی ہمت بھی نہیں ہے۔ ان کے تمام خیالات سے سامعین نے اتفاق کیا تھا اور تالیوں کی بھرپور گونج کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔ ورکروں کے درمیان اس بات کا

چرچا تھا کہ احمد اپنی پاکیزہ شخصیت کے ساتھ عظیم خیالات کے مالک ہیں۔ فیکٹری کی میٹنگ ختم ہونے کے بعد جب میں احمد کے ساتھ گھر واپس آئی تو دل مسرت اور شادمانیوں کے جذبے سے لبریز ہورہا تھا۔ اس رات کافی دیر تک احمد مجھے فیکٹری کے کاموں کے متعلق بتاتے رہے۔ ان کی میٹھی میٹھی پرخلوص باتیں سنتے سنتے نہ جانے کب میں نیند کی وادیوں میں کھوگئی مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ احمد کی ساری خوبیوں نے مل کر مجھے ان کا دیوانہ بنا دیا ہے۔ ان کے بغیر وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ خدا نے جس طرح انھیں حسن و جاہت سے مالا مال کیا ہے اسی طرح دل کو بھی محبت اور خلوص کے جذبے سے بھر دیا ہے۔

شادی سے پہلے میں بی۔اے فائنل کی طالبہ تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں میں اپنی تعلیمی قابلیت کی وجہ سے اساتذہ کی منظور نظر تھی۔ چونکہ خدا نے مجھے حسن کی بے پناہ دولت عطا کی تھی اس وجہ سے میں اپنی تمام سہیلیوں میں مقبول تھی۔ اس کے علاوہ والدین کی تعلیم و تربیت نے میری شخصیت کو ایک انوکھا نکھار بخش دیا تھا۔ مگر اپنی ان تمام خصوصیتوں کے باوجود میری اپنی یہ خواہش تھی کہ میں اپنی تعلیم مکمل کرلوں کیونکہ میرا یہ خیال تھا کہ عورت کو کسی بھی حالت میں مرد کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ احمد نے میرے اس جذبے کا بھی احترام کیا اور میری تعلیم مکمل کروائی۔ یہی نہیں انھوں نے بھرپور کوشش کے بعد مجھے کالج کی لکچرر شپ دلوائی۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے ایک پرکشش گھر کی ذمہ داریاں دیں اور مصروفیت کے لیے ایک گول مٹول پیارے پیارے شمو کی ماں بنا دیا۔

میری شادی کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا کہ ایک دن میں اس خیال سے بے حد اداس ہوگئی تھی کہ رخصتی کے وقت میں والدین کی جدائی کے خیال سے کس قدر پھوٹ کر روئی تھی مگر ایک ہفتہ گزر گیا اور مجھے ان کی یاد تک نہ آئی۔ مجھے اداس دیکھتے ہی احمد بے چین ہو اٹھے اور شہر کی سیر کرانے لے گئے۔ پارک میں ہر طرف پھول ہی پھول کھلے تھے اور ننھی ننھی چڑیوں نے چہک

چمک کر ایک دلفریب سماں پیدا کر دیا تھا۔ احمد کے پیار اور ان بہاروں کے درمیان کھو کر میں یہ بالکل بھول گئی کہ کچھ دیر قبل میں کس قدر غمگیں اور اداس تھی۔ جب بھی کبھی میں اداس لمحوں سے دو چار ہوئی احمد مجھے ان لمحوں سے نکال کر کسی طرف لے جاتے۔ احمد جیسی شخصیت بے شک دل و دماغ پر حکومت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ ہنستے مسکراتے قابل اعتماد پر خلوص پر وقار اور ہر زاویے سے مطمئن اپنے شریک حیات کے لیے میں مالک حقیقی کی بارگاہ میں ہر وقت خلوص دل کے ساتھ یہ دعا کرتی رہتی ہوں کہ یا خدا یہ اجلی اجلی سی شخصیت تا حیات میری زندگی میں خوشیوں کی کرنیں بکھیرتی رہے۔

اچانک ہی دوروازہ زور سے کھلنے کی آواز سے نرم و نازک اور لطیف احساسات سے بنا ہوا سپنوں کا حسین شیش محل حقیقت کی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو گیا، ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھر گیا۔ اس کی خوں آشام کرچیاں اس کے پورے وجود میں گڑ کر اسے لہولہان کر گئیں۔ وہ گہری نیند سے چونک کر بیدار ہو گئی اور اس کا ذہن جس نے خواب کی دلفریب سہانی وادی میں اس حسین جنت کی تخلیق کی تھی وہ اسے بے رحمی سے گھسیٹ کر حقیقت کی اس سم آلود دنیا میں لے آیا جہاں پیار کا کوئی قصر نہیں تھا۔ مسرت اور شادمانیوں سے آراستہ کیا ہوا جگمگاتا شیش محل نہیں تھا۔ یہ تو وہ گھر تھا جہاں ہر طرف اندھیروں نے اپنا جال بن رکھا تھا۔ جہاں کا فرش پتھریلا اور دیواریں خستہ تھیں۔ جہاں چہروں کو جھلسنے والی اور شخصیت کو مسخ کر دینے والی بے رحم ہوائیں تھیں۔ اور اس کے ناتواں وجود سے لپٹے ہوئے مجبوریوں کے کالے سانپوں کے رینگنے کی دہشت ناک سرسراہٹیں تھیں۔ جہاں دکھ تھا، درد تھا، حسرتوں اور پریشانیوں کی نہ ختم ہونے والی بہت ہی لمبی، بے حد تاریک اور ڈراؤنی سرنگ تھی۔ آنکھ کھلنے کے فوراً ہی بعد اسے خیال آیا کہ گھر کے ماحول سے تنگ آ کر آج شمو سعودی عرب چلا گیا ہے۔ جاتے وقت وہ اس سے لپٹ کر زار و قطار رویا تھا۔ جاتے وقت شمو اسے اپنا پرانا سوئٹر دے کر گیا تھا کہ وہ اسے اپنے پہننے کے قابل

بنا لے کیونکہ جاڑا گزارنے کے لیے اس کے پاس ایک بھی گرم کپڑا نہ تھا۔ شمو کے چلے جانے کے بعد وہ دل برداشتہ سی ہو کر برآمدے میں پڑی ہوئی ایک ٹوٹی پھوٹی انتہائی شکستہ سی کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور اس کی مرمت کرتے کرتے سو گئی تھی۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی وہ یہ سوچ کر ایک بار پھر تڑپ اٹھی کہ اس کا جوان بیٹا شمو جو قدرت کا ایک عظیم فیضان تھا وہ اس سے بچھڑ گیا ہے۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد احمد تو بڑبڑاتا ہوا کچن میں چلا گیا اور وہ خود کرسی سے اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے کے اندر آ گئی۔ اندر آ کر اس نے سامنے دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اپنے سراپا کا بغور جائزہ لیا۔ جھریوں بھرے چہرے اور سر کے سفید روکھے سوکھے بالوں کو دیکھ کر ایک سرد سی آہ اس کے ہونٹوں پر آ کر لرز گئی اور اس نے دکھے دل کے ساتھ سوچا، زندگی کے چھپن سال پر لگا کر اڑ گئے اور گزرنے والے وقت کے تمام ماہ و سال نے مجھے تلخیوں کے سوائے کچھ نہ دیا۔ ہائے اب تو زندگی کی شام بھی آ گئی۔ میں تہی داماں ہی رہی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے کلیجے کے اندر ایک ہوک سی اٹھی، آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے گالوں پر لڑھک آئے اور وہ دل تھام کر بستر پر دراز ہو گئی۔ پلکیں آپ ہی آپ مند گئیں اور ذہن ماضی کے اُن لمحوں کی طرف پرواز کرنے لگا جب وہ پیاری اور گڑیا سی لڑکی شاہدہ تھی۔ جس کا چاند سا مکھڑا شہابی رنگ اور بڑی بڑی پرکشش آنکھیں تھیں۔ اس وقت اسے کہانیوں کا بہت ہی شوق تھا۔ ہر رات وہ اپنی نانی اماں کے پاس گھس کر راجا رانی اور پری شہزادوں کی کہانیاں سنتے سنتے سپنوں کے نگر میں کھو جایا کرتی تھی۔ صرف اٹھارہ سال کی عمر میں جب وہ بی۔اے فائنل میں تھی والدین نے اس کے لیے رشتوں کی تلاش شروع کر دی۔ اور ایک ایسے گھرانے میں جوان کے معیار پر پورا اترتا تھا اس کی شادی کر دی۔ لیکن اس گھر میں شادی کرتے وقت اس کے والدین نے یہ نہ دیکھا کہ اپنی پڑھی لکھی بیٹی کو وہ جس خاندان کے سپرد کر رہے ہیں وہ ان کی پوزیشن کی برابر کا تو ہے لیکن اس کے ساتھ ہی حد درجہ جہالت کی زنجیروں میں بھی جکڑا ہوا ہے۔ چنانچہ احمد کو جس وقت یہ معلوم ہوا کہ

اس کی دلہن بی۔اے فائنل کر رہی ہے اور حد درجہ حسین ہے تو ایک خیال زہریلے ناگ کی طرح اس کے ذہن میں پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا کہ اتنی خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی اسے کب خاطر میں لائے گی۔ساتھ ہی اس کی ماں اور بہنوں نے بھی اس کے خیال کو ہوا دی کیونکہ وہ اپنی نکمی فطرت اور گھر کے گندے ماحول کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار تھا۔لہٰذا اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شاہدہ کے تمام سرٹیفکٹ اور کتابیں لوہے کی ایک الماری میں مقفل کر کے اس کی چابی آنگن کے کوئیں میں پھینک دی اور اس سے بالکل نوکرانیوں جیسا سلوک کرنے لگا۔اس کے ساتھ احمد کا یہ رویہ دیکھ کر احمد کی ماں بہنوں کی بن آئی اور انھوں نے اسے چند دنوں تک بھی دلہن بن کر رہنے نہیں دیا۔برتن مانجنے سے لے کر گئی رات تک گھر کے سارے کاموں کو نپٹانا اس کا معمول بنا دیا گیا۔اتنی ہی نہیں بلکہ اُن کی شب و روز کی زیادتیوں نے اس کا جینا حرام کر کے رکھ دیا۔اگر کبھی وہ دبی زبان سے ان زیادتیوں کی شکایت احمد سے کرنا چاہتی تو وہ اس سے آنکھیں نکال کر کہتا میں فضول بحث و مباحثہ میں پڑنے کا عادی نہیں ہوں۔اگر تمہیں اس گھر میں رہنا ہے تو تمہیں ہر اس بات پر عمل کرنا پڑے گا جو تمہیں کہی جائیں گی۔یہ سن کر شاہدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عجیب انسان کی طرف دیکھتی رہ جاتی جس کا چہرہ جذبات و احساسات سے بالکل عاری تھا۔اس غم انگیز صورت حال سے دوچار ہو کر شاہدہ بالکل گھٹ کر رہ گئی اور خود اپنی ہی نظروں میں بے وقعت بن گئی۔اس کے دل کو اس بات کا بہت ہی شدید صدمہ پہنچا کہ اس کے والدین نے اسے دیدہ و دانستہ اس اندھے کوئیں میں دھکا دیا ہے۔یہ اتنا سنگین ظلم تھا کہ وہ ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی۔اسے یہ خیال اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگا کہ احمد اس کی زندگی میں اس بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح داخل ہوا ہے جس کی آگ میں جل کر ایک دن اس کا پورا وجود صرف راکھ کا ایک ڈھیر بن کر رہ جائے گا۔اس احساس کو دل سے لگائے وہ جیتی رہی اور گزرتے وقت کے ساتھ اس کی زندگی میں کہرا چھانے لگا اور چاروں طرف سے ایک گھور اندھیرے نے اس کے وجود کو اپنے

چنگل میں جکڑ لیا۔ شاہدہ کو ایسا لگتا کہ جیسے اس کائنات میں وہ بالکل اکیلی ہے، ایک دم تنہا۔ اس کا شریک حیات احمد اس کی منزل نہ تھا۔ پھر بھی شاہدہ نے اس کی ساری خواہشوں کو پورا کیا اور اس کی ساری گندی عادتوں کا بھرم رکھا۔ مگر احمد نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے حسین چہرے پر کالک مل دی۔ یہاں تک کہ شمو کی پیدائش بھی اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ لا سکی۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ شاہدہ اتنی دل برداشتہ ہوگئی کہ ایک بار جب اس کے والدین اس سے ملنے کی خاطر آئے تو اس نے کہہ دیا کہ اب میرا وجود حسرتوں کا ایک مزار بن چکا ہے۔ لہٰذا برائے مہربانی آپ لوگ آئندہ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے نہ آیا کریں۔ اس کے بعد ان لوگوں نے بھی اس سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس طرح وقت کی پرواز نے اسے رفتہ رفتہ راہ حیات کی اس منزل پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں وہ اپنی ٹوٹی بکھری تمناؤں کا عکس صرف خوابوں کی دنیا میں پا سکتی تھی۔ ان خوابوں کا عکس جن کی موت مدتوں پہلے ہو چکی تھی۔

☆☆☆

گری تھی جس پہ کل بجلی

زاہد منصور صاحب آج بے انتہا خوش تھے۔ ان کے خوبصورت باوقار چہرے پر مسرت کی انگنت لکیریں کھیل رہی تھیں۔ اس خوشی اور مسرت کی وجہ یہ تھی کہ وہ آج کی شام اپنے ہونہار اور جوان بیٹے ثاقب کے لیے دلہن دیکھنے جا رہے تھے۔ بے شک ایک والد کے لیے وہ وقت بڑا ہی کیف پرور اور مسرت انگیز ہوتا ہے جب اس کی اولاد کے سر پر سہرا بندھتا ہے۔ چونکہ ثاقب نے اب ملازمت جوائن کر لی تھی۔ اس لیے وہ اس کی دلہن گھر میں لانے کو بے قرار تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے دوست ایاز سے گفتگو کی تھی۔

ان کی خواہش جان کر ایاز نے انھیں اپنے ایک قریبی دوست آفتاب عالم کا پتہ دیا تھا۔ آفتاب عالم اسی شہر میں رہتے تھے اور سیلز ٹیکس میں انسپکٹر کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ایاز نے منصور صاحب کو بتایا تھا کہ ان کی لڑکی سحر بڑی ہی تعلیم یافتہ، سلیقہ مند اور بے حد خوبصورت ہے۔ وہ ثاقب جیسے سنجیدہ لڑکے کے لیے بے حد موزوں رہے گی۔ اپنی بیگم فردوس سے شام کو تیار رہنے

کے لیے کہہ کر منصور صاحب آفس کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد بیگم فردوس نے گھر کے تمام کاموں کو سمیٹا اور شام آنے سے قبل ہی تیار ہو کر اپنے شوہر کا انتظار کرنے لگیں۔ منصور صاحب شام کو گھر واپس آئے تو بیگم کو تیار ہو کر اپنا منتظر پایا۔ یہ دیکھ کر ان کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ انھیں اپنی فردوس سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ انھیں اپنی متاعِ حیات سمجھتے تھے۔ نازک اندام فردوس اس عمر میں بھی حد درجہ خوبصورت گڑیا سی دکھائی دیتی تھیں۔ برآمدہ میں پڑی کرسی پر بیٹھ کر انھوں نے فردوس کے ساتھ ہلکا سا ناشتہ کیا اور چائے پی کر وہ دونوں ایاز کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے ایاز کو اپنے ہمراہ لیا اور ان کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد یہ لوگ آفتاب عالم صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔

آفتاب عالم ادھیڑ عمر کے ایک بے حد خوبرو اور خوش اخلاق انسان تھے۔ وہ بہت ہی تپاک کے ساتھ ان لوگوں سے ملے۔ ان کی خوش اخلاقی اور زندہ دلی نے بہت ہی جلد منصور صاحب کا دل جیت لیا اور جب ان کی لڑکی سحر چائے کی ایک خوشنما ٹرے لے کر ان کے سامنے آئی تو اسے دیکھ کر ان کا دل مسرت سے جھوم اٹھا۔ وہ ایک ہی نظر میں ان کے دل کے اندر اتر گئی تھی۔ واقعی میں وہ ایک ایسا نازک سا پھول تھی جسے چھو لینے سے ہی اس کی پنکھڑیاں میلی ہو جاتی ہیں۔ منصور صاحب نے جھٹ اپنی رضامندی دے دی اور اگلے ماہ کی تاریخ پکی کر دی۔ خوشیوں اور مسرتوں کے گھورائے میں جھولتے ہوئے جب منصور صاحب اپنے گھر واپس آئے تو وفور انبساط سے ان کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ گھر آنے کے بعد بیگم فردوس رات کے کھانے کی تیاری میں کچن کے اندر اس درجہ مصروف ہو گئیں کہ منصور صاحب کو اس سلسلے میں ان سے مزید باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ کھانا کھانے کے بعد وہ تھکاوٹ کی وجہ سے بستر پر سونے کی غرض سے دراز ہو گئے۔ بستر پر دراز ہوتے ہی بہت جلد نیند کی مہربان دیوی نے انھیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور وہ خوش آئند مستقبل کا خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے نیند کی وادی

میں گم ہو گئے۔

جس وقت منصور صاحب اپنی آنکھوں میں خوشیوں کے سپنے سمیٹے ہوئے نیند کی آغوش میں گم تھے اس وقت انھیں کیا پتہ تھا کہ ان کے کمرے سے ملحقہ دوسرے کمرے کے اندر ان کی پیاری بیگم فردوس کی آنکھوں میں نیند کا کوئی نام ونشان تک نہ تھا۔ اس وقت تو بیگم فردوس اپنے کمرہ میں ایک کرسی پر گم سم سی بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔

ان کے سامنے کی میز پر زہر کی بھری شیشی رکھی تھی اور اسی میز پر خط لکھنے کا پیڈ اور ایک کھلا ہوا قلم پڑا تھا۔ اس زہر سے انہیں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا تھا مگر اس سے پہلے انھیں اس پیڈ پر اپنی خودکشی کی وجہ بھی تحریر کرنی تھی۔ اپنے شوہر کو اپنے اس انتہائی قدم اٹھانے کے راز سے آگاہ کرنا تھا۔ ان کی سوگوار آنکھیں زہر کی شیشی پر ٹکی تھیں اور ذہن سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد یہ قاتل زہر ان کے جسم میں سرایت کر کے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دے گا اور پھر آنے والی صبح کی اوّلین ساعتوں میں ان کا جسد خاکی تمام لوگوں کے لیے ایک حیرت انگیز سوال بنا ہوا فرش زمین پر پڑا ہوگا اور ہر زبان پر صرف ایک ہی سوال ہوگا ایسا کیوں ہو گیا؟ آخر کس دکھ نے انھیں ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ خدا نے تو انھیں دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازا تھا۔ زاہد منصور جیسا جان چھڑکنے والا انسان ان کا شوہر تھا۔ ایک خوبرو تعلیم یافتہ برسرِ روزگار بیٹا تھا، ایک چاندنی شادی شدہ بیٹی تھی۔ پھر انھوں نے ایسا قدم کیوں اٹھایا؟ ان تمام سوالوں کا جواب تو صرف وہی دے سکتی تھیں مگر ان کی زبان پر تو اس وقت موت کی خوفناک خاموشی کی مہر ثبت ہو چکی ہوگی۔ لیکن اپنی موت کا المناک راز اپنے شوہر پر ظاہر کیے بغیر وہ زہر کی شیشی اپنے حلق کے اندر نہیں انڈیل سکتی تھیں۔ اس خیال کے آتے ہی ایک دل دوز سی آہ ان کے سینے سے ابھری۔ یہ ایک ایسی آہ تھی جس کو صرف انھوں نے ہی محسوس کیا اور پھر ان کا قلم تیزی کے ساتھ پیڈ پر دوڑنے لگا۔

گرم اور تاریک رات سن سن کرتی ہوئی بھاگتی رہی اور بیگم فردوس لکھنے میں مشغول

رہیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اندھیرے کی دبیز چادر کا پردہ پھٹنے لگا اور صبح کی اذان نے رات کے گزرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے سنتے ہی ان کے دل کی گہرائی سے ایک گھٹی ہوئی آہ نکل گئی جس نے ان کے پورے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کی نظریں زہر کی شیشی کی طرف اٹھیں اور لبوں سے آہستہ آہستہ یہ کلمات ادا ہوئے "اے میرے پروردگار تو بڑا ہی رحیم و کریم ہے۔ گناہوں کو بخش دینے والا ہے۔ اس لیے اے میرے معبود، مجھے اس گناہ کے لیے معاف کر دینا۔" ان کلمات کے ادا ہوتے ہی انھوں نے اپنے سامنے رکھی ہوئی وہ قاتل زہر کی پوری شیشی اپنے حلق کے اندر اتار لی۔ اور پھر اس کے بعد ہی انھیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان کے جسم کے ساتھ ان کا ذہن ان کا دل اور ان کا دماغ کسی اندھیرے گوشہ کے اندر ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے بعد انھیں کوئی خبر نہ رہی کہ کب ان کا بے جان جسم کرسی سے لڑھک کر زمین پر جا پڑا۔

صبح کی اذان ختم ہو جانے کے کچھ دیر بعد جب منصور صاحب کی آنکھ خود بخود کھلی تو وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی بیگم نے انھیں صبح کی نماز کے لیے بیدار نہیں کیا تھا۔ انھیں کچھ تشویش ہوئی اور وہ اٹھ کر فردوس کے کمرہ کے اندر چلے گئے۔ کمرہ کے اندر داخل ہو کر انھوں نے جو کچھ دیکھا اس نے ان کے ہوش اڑا دیے۔ فردوس فرش زمیں پر پڑی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں زہر کی کھلی ہوئی شیشی تھی اور میز پر ایک خط لکھا ہوا پڑا تھا۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہے تھے۔ ان کا پورا جسم ایک بھیانک زلزلہ کی زد میں تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے کسی طرح وہ خط اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالا اور پھر وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو کر فردوس کی لاش کے قریب لہرا کر گر پڑے۔ تب تک ان کی گھٹی ہوئی چیخ گھر کے کونے کونے میں پہنچ گئی تھی اور پل بھر میں ہی گھر کے سارے افراد کمرہ کے اندر آ کر جمع ہو گئے تھے۔ کمرہ کا ماحول بڑا بھیانک لگ رہا تھا۔ ایک کہرام برپا تھا اور محلّہ والوں کی بھیڑ جمع ہوتی جا رہی تھی۔ بیگم فردوس کا پورا جسم نیلا پڑ چکا تھا اور وہ ابدی نیند سوئی تھیں۔ منصور صاحب کو بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا

تھا۔ وہ ایک طرف سر جھکائے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں سے لگاتار آنسو رواں تھے۔ اور دل اس حقیقت کو ماننے سے صاف انکار کر رہا تھا کہ ان کی وہ عزیز از جان شریک حیات جن کی فرقت انھیں ایک پل کے لیے بھی گوارا نہ تھی وہ اب ان کا ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے جوان بیٹے ثاقب کا دل بھی اس سوال کا جواب پانے کے لیے تڑپ رہا تھا کہ اس کی وہ ماں جس نے اس گھر میں ایک بیوی اور ایک ماں کا فرض بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا تھا اسے کون سے دردِ نہاں نے اس درجہ مجبور کر دیا کہ اسنے موت کو گلے لگا لینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے اس سوال کا جواب پانے کے لیے تڑپتا رہا۔ اور بیگم فردوس اپنے آخری قیام گاہ کے لیے روانہ ہوگئیں۔ اس کے بعد تمام دوستوں عزیزوں اور رشتہ داروں نے بھی اپنے اپنے گھروں کی راہیں لے لیں۔ دنیا کے معمول میں کہیں پر کوئی فرق نہیں آیا کیونکہ جب سے اس کائنات کی تخلیق ہوئی ہے یہ سلسلہ چلتا آ رہا ہے اور چلتا ہی رہے گا۔ نہ جانے کیسی کیسی جان سے بھی پیاری ہستیاں درمیان سے اٹھ جاتی ہیں۔ ان کے سپردِ خاک ہونے تک لوگ پچھاڑیں کھاتے ہیں اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد وہ دنیا کی دلچسپیوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ انکے ذہن میں ان کی یادیں تک باقی نہیں رہتیں۔ تمام لوگوں کے چلے جانے کے بعد گھر کے صرف تین افراد افسردہ اور ملول سے گھر کے اندر تنہا رہ گئے۔ تینوں اپنی اپنی جگہ خاموش ساکت تصویر یاس و دردوغم بنے بیٹھے تھے۔ اس چھوٹے سے گھر کے ان تینوں افراد کے دل و دماغ غم کی بھٹی میں سلگ رہے تھے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی کے سارے خواب سارے رنگ پل بھر میں اڑ گئے ہیں اور ان کا دل آج کسی خالی مکان کی طرح خالی ہوگیا ہے۔ رفتہ رفتہ شام سرکنے لگی اور کچھ ہی دیر کے بعد رات کی تاریکی نے آگے بڑھ کر رات کی سیاہی کو سناٹے کی آغوش میں روپوش کر دیا۔ آدھی رات گزر جانے کے بعد ثاقب اور اس کی بڑی بہن ثناء جو ایک ہفتہ قبل سسرال سے آئی تھی دونوں نڈھال ہو کر نیند کی آغوش میں چلے گئے مگر

منصور صاحب کی آنکھیں جاگتی رہیں۔

اپنے دونوں بچوں کے سو جانے کے بعد منصور صاحب نے فردوس کا خط اپنی جیب سے نکالا اور اسے از سرِنو پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ وہ تحریر تھی جس نے ان کے خرمن دل پر کڑکتی ہوئی بجلی گرادی تھی اور ان کے ذہن و دماغ کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔

انکی نظریں خط کی تحریر پر دوڑ رہی تھیں اور تیس سال قبل کی پچھلی یادیں یادوں کی محفل سے نکل نکل کر ان کے سامنے آرہی تھیں۔

تیس سال قبل منصور صاحب ایک سیدھے سادے بے حد خوبصورت تندرست و توانا نو جوان تھے۔ ان کا گھرانا امیر نہ تھا مگر بہت ہی شریف اور مہذب تھا۔ وہ ایک بینک میں کلرک تھے۔ زندگی کے اسی سنہرے دور میں فردوس ان کی زندگی میں مجسم بہار بن کر داخل ہوئی تھیں۔ بالکل گڑیا سی سرخی مائل، گورا رنگ، پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ، بڑی بڑی مدہوش کن آنکھیں، لمبے گھنے سیاہ بال۔ انکی قربت سے منصور صاحب کا پورا وجود بھینی بھینی خوشبو کی طرح مہک اٹھا تھا۔ شادی کے دو سال بعد ان کے بہارِ چمن میں ان کے پیار کی پہلی نشانی ثنا ایک کلی بن کر مسکرانے لگی۔ مگر ثناء کی پرورش والدین کے پیار بھرے گہوارہ میں ہوتے ہوئے ابھی بہت ہی مختصر سا وقت گزرا تھا کہ اچانک ہی ان کے خوشبو بھرے گلشن میں خزاؤں نے اپنا ڈیرہ جما لیا اور بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکے لہرانے لگے۔ معصوم ثناء صرف ایک سال کی ہی ہو پائی تھی کہ ایک مہلک ترین بیماری نے منصور صاحب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ان کی کشتیِ حیات موت و حیات کے بیچ بھنور میں ڈگمگانے لگی۔

محدود سی آمدنی میں بیگم فردوس نے جو رقم پس انداز کی تھی وہ ساری رقم انکے علاج پر خرچ کر دی گئی۔ مگر ان کے مرض میں کوئی افاقہ نہ ہو سکا۔ ایسے نازک وقت میں ان کے جگری دوست ایاز نے ان کی مدد کی۔ کبھی کبھی تو بیگم فردوس پر ایسا وقت آجاتا کہ انھیں ایاز کے گھر جا کر ان

کی بیوی سے بطور قرض رقم مانگنی پڑتی۔ وہ شرم سے کٹ کٹ جاتیں مگر ان کے سامنے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں رہتا۔

باوجود جان توڑ محنت اور علاج کے ان کے مرض میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ بہر حال دن رات کی محنت اور کوششوں کے ذریعہ دکھوں سے پر یہ ایام کسی نہ کسی طرح گزر گئے اور ڈاکٹروں نے ان کے مرض پر قابو پا لیا۔

وقت دوبارہ اپنے محور پر حسب سابق گردش کرنے لگا اور اس کی گردش کے ساتھ چلتے ہوئے ان کے گلشنِ حیات میں ایک دوسرا پھول ثاقب کی شکل میں کھل اٹھا۔ اور پھر وقت کے تیز دھار کے ساتھ بہتے ہوئے وہ وقت بھی آ گیا جب ثناء اور ثاقب دونوں نے شباب کی منزلوں میں قدم رکھ دیا۔ ثناء کے گریجویشن کرتے ہی انھوں نے اس کی شادی ایک اچھے گھرانے میں کر دی اور ثاقب ڈبل ایم۔ اے کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ کمپنی میں نوکر ہو گیا۔ ثاقب کے بر سر روزگار ہوتے ہی انہیں اپنے گھر کے لیے ایک چاند سی بہو کی فکر ستانے لگی۔ اسی طرح سے وہ اپنے گھر کا وہ خلاء بھی پر کرنا چاہتے تھے جو ثناء کی شادی کے بعد ان کے گھر میں پیدا ہو گیا تھا۔ اسی غرض کی بناء پر وہ آفتاب عالم کے یہاں فردوس کے ساتھ گئے تھے اور ان کی لڑکی سحر انہیں پسند بھی آ گئی تھی۔ مگر ان کی دیرینہ آرزو پوری ہونے بھی نہ پائی کہ اس دلخراش حادثہ نے اس گھر کی خوشیوں پر اپنے نحوست کے پنجے گاڑ دیئے۔ منصور صاحب کی نمناک نگاہیں فردوس کی تحریر پر دوڑ رہی تھیں۔ اور دل و دماغ کے اندر غم کی آندھیوں کے بگولے اٹھ رہے تھے۔

میری روح کے مالک!

میں جانتی ہوں کہ میرے اس فعل پر آپ سخت حیران اور پریشان ہوں گے اور آپ کے ساتھ تمام لوگ اس گتھی کو سلجھانے میں لگے ہوں گے کہ میں نے آخر ایسا قدم کیوں اٹھایا؟ مگر میری زندگی کے ہم سفر میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ یہ وہ وقت ہے جس نے آج مجھے زندگی کے

ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے جہاں میرے سامنے اس راستہ کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لیے میں اس دنیا سے سدا کے لیے اپنا ناطہ توڑ رہی ہوں۔ ہو سکے تو آپ مجھے میرے اس گناہ کے لیے معاف کر دیں گے۔

میری بدنصیبی کی داستان اس دن سے شروع ہوتی ہے جس دن آپ پر مرض کا شدید حملہ ہوا تھا اور آپ ایسے بے ہوش ہو گئے تھے کہ ہوش میں لانے کی ہر صورت ناکام ہو چکی تھی اسی وقت ڈاکٹر جمال نے اپنے تجربہ کی بنا پر آپ کے لیے ایک ایسا انجکشن تجویز کیا جو آپ کی جان بچانے کے لیے فوری طور پر ضروری تھا۔ مگر اس انجکشن کی قیمت پانچ سو روپئے تھے۔ اس وقت میں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر مجھے گھر سے ایک پھوٹی کوڑی تک نہ مل سکی۔ اور میں بدحواسی کے عالم میں ایاز کے گھر کی طرف بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ایاز ایک ہفتہ قبل کسی شادی میں شرکت کی غرض سے شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ چونکہ باہری دروازہ کھلا ہوا تھا اسی وجہ سے میں بے تحاشہ گھر کے اندر چلی گئی۔ مگر باہری کمرہ کے اندر ایاز کے بجائے کسی دوسرے شخص کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کر میں الٹے پاؤں واپس ہونا ہی چاہ رہی تھی کہ اس نے مجھے آواز دیکر روک لیا اور کہنے لگا۔

''سنئے آپ غالباً مسٹر ایاز سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ گزشتہ ہفتہ کلکتہ چلے گئے ہیں اور اپنی غیر حاضری میں یہ مکان میری تحویل میں دے گئے ہیں۔ ان کا قریبی عزیز ہوں۔ آپ مجھے ان کی جگہ ہی سمجھیں اور اطمینان کے ساتھ اپنا مدعا بیان کریں۔ شاید میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔ اس کی باتوں میں نہ جانے ایسی کون سی کشش تھی کہ میرے دل کو ایک ڈھارس بندھ گئی۔

میں قریب پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور مختصر لفظوں میں اس سے اپنی بدنصیبی کی داستان اور گاہے بگاہے ایاز کی مدد کے متعلق بتا دیا۔ اس نے اپنائیت بھرے لہجہ میں مجھ سے کہا ''گھبرائیں نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ چند منٹ یہاں ٹھہر کر میرا انتظار کریں میں اندر

سے رقم لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ اس کے اندر جاتے ہی میں نے کرسی کی پشت پر اپنا سر ٹکا دیا۔ سر ٹکاتے ہی ایک لمحے کے لیے میری آنکھیں بند ہو گئیں بلکہ ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ دروازہ بند ہونے کی آواز پر میں چونک اٹھی اور آنکھیں کھول کر دیکھا کہ وہ اجنبی شخص بالکل میرے قریب کھڑا ہے اور اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ میں فوراً ہی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے قریب آ کر جب میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو یہ دیکھ کر کانپ گئی کہ دروازہ لاک ہو چکا تھا۔ اتنی دیر میں وہ میرے اور بھی قریب آ گیا اور انتہائی گھناؤنے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔

''آپ کوئی بھی ہوں۔ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ آپ ایک ضرورت مند ہیں اور دنیا میں ایک انسان کی ضرورت دوسرے انسان سے جڑی رہتی ہیں۔ آیئے ہم دونوں مل کر ایک دوسرے کی ضرورت بن جائیں۔ مجھے ایک خوبصورت جسم کی ضرورت ہے اور آپ کو ایک معقول رقم کی۔ میں آپ کے لیے پانچ ہزار کی رقم لے آیا ہوں۔ اس سے آپ اپنے شوہر کا بخوبی علاج کروا سکتی ہیں۔'' اس کے یہ غلیظ الفاظ سن کر مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ اور اس سے پہلے کہ میرا بھرپور طمانچہ اس کے گالوں پر پڑتا۔ اس نے ایک باز کی طرح مجھے اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔ میں نے اس ظالم کے پنجے سے خود کو چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اس درندے کے سامنے میری تمام قوت مدافعت بیکار ثابت ہوئی اور مجھے بے بس کرنے کے بعد جب شیطان مجھ پر پوری طرح سایہ فگن ہو گیا تو میں مارے صدمے اور ذلت کے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہ شیطان کہیں غائب ہو چکا تھا اور ٹیبل پر پانچ ہزار کے نوٹ پڑے تھے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ گزرنے والا وہ سفاک لمحہ مجھ سے میرا سکون، میرا اطمینان، میری خوشیاں اور میری کل کائنات مجھ سے چھین کر چلا گیا ہے۔ تب میرے دل نے چاہا کہ میں اس وقت اپنے وجود کا خاتمہ کر ڈالوں۔ تب ہی مجھے آپ کی طویل بے ہوشی یاد آئی اور موت و زیست

کے درمیان ہچکولے کھاتی ہوئی آپ کی کشتی حیات، میں نے آگے بڑھ کر ان پانچ ہزار روپیوں کو اپنے آنچل میں سمیٹا اور اپنے کاندھوں پر اپنا زندہ جنازہ ڈھونے کا عزم وارادہ کر لیا۔

آپ کا علاج چلا اور ڈاکٹروں کی کوششوں نے آپ کو دوبارہ نئی زندگی دی۔ آپ صحت یاب ہو کر خوش وخرم رہنے لگے۔ زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔ مگر کاتب تقدیر کو اتنے پر رحم نہیں آیا۔ اور ایک دن مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اس شیطان کی لعنت میرے وجود کے اندر پل رہی ہے۔ ایک بار پھر اس خوفناک زندگی سے چھٹکارا پانے کا خیال میرے دل میں سر ابھارنے لگا۔ مگر ڈاکٹروں نے ایک طویل عرصہ کے لیے آپ کو کسی ذہنی صدمہ سے دور رہنے کی تاکید کی تھی۔ آپ کی زندگی بچانے کا یہ دوسرا سوال ایک بار اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور میں خاموش رہ کر اندر ہی اندر ٹوٹ کر ذروں میں بٹ گئی۔ پھر ثاقب پیدا ہوا اور آپ نے اسے گلے لگا لیا۔ شاید یہ بے حیا زندگی کسی طرح کٹ جاتی کہ وقت نے اچانک ایک اور خوفناک موڑ لے لیا۔ اور اس منزل پر آ کر میں ہار گئی اور بالآخر وہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئی جو آج سے اٹھائیس سال پہلے مجھے اٹھانا چاہیے تھا۔ سحر اسی درندے کی بیٹی ہے جس نے برسوں پہلے ہمارے ہرے بھرے گلشن کو اپنی ہوس کی آگ میں جلا ڈالا تھا۔ میں اس کی شکل کس طرح بھول سکتی ہوں۔ میں موت کو اس لیے گلے لگا رہی ہوں کہ آپ کی نظروں سے گر کر میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔

بدنصیب

فردوس

منصور صاحب ماضی کے دھندلکوں میں الجھے تمام شب فردوس کی یادوں سے کھیلتے رہے۔ ان کی محویت اسی وقت ٹوٹی جب صبح صادق کی نورانی کرنوں نے کائنات عالم پر اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ دور کہیں مسجد کے میناروں سے اذان کی آواز گونجنے لگی تو وہ تڑپ اٹھے۔ اور دل بے اختیار پکار اٹھا۔ میرے معبود آج کا یہ انسان کتنا بے مروت، کتنا ریاکار اور کتنا نفرت انگیز

ہوگیا ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ درندہ صفت انسان کب کس کا ہرا بھرا چمن لوٹ لے، کب کس کی ازدواجی زندگی جہنم بنادے۔ کب کسی کی شریک حیات کو کب کس کی بیٹی کب کس کی بہن کو زہر کا جام پینے پر مجبور کردے۔ اے میرے مالک کیا آج کا انسان پاکیزہ زندگی بسر نہیں کرسکتا ہے۔ کیا دنیا سے وفا، دوستی، خلوص، محبت اور انسانیت کا چلن اٹھ گیا ہے اور پھر وہ دل کے سکون کے لیے مالک حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوگئے۔

☆☆☆

انمول جہیز

اپنا کلاس ختم کرنے کے بعد حنا تھکے تھکے قدموں سے کامن روم کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے نپے تلے قدم اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ کسی بہت ہی بڑی الجھن سے دوچار ہے۔ بوجھل بوجھل افسردہ سی وہ کامن روم کے قریب آئی اور دروازے پر پڑا ہوا خوش رنگ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوگئی۔ کامن روم میں اس وقت مکمل طور پر سناٹے کا راج تھا کیونکہ تمام اسٹاف اپنے اپنے کلاس لے رہے تھے۔ سیلنگ فین کی گھن گھن اس خاموش فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر رہی تھی اور اس سے نکلنے والی ہوائیں ٹکرا کر فائلوں کے اوراق پھڑ پھڑا رہے تھے۔ حنا اپنی مخصوص کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ ماحول کی اداسی نے اس کے ذہن کو مزید سوگوار بنا دیا تھا۔ یوں تو اس کا پاکیزہ حسن کسی مغل شہزادی کی یاد تازہ کرتا تھا۔ مگر گزشتہ شب کی بیداری کی وجہ سے اس وقت اس کا دودھ میں نہایا سنگ مرمر کا سراپا ملگجا سا لگ رہا تھا۔

سہنا ہائی اسکول میں حنا کا تقرر بائلوجی سبجیکٹ پڑھانے کے لیے ہوا تھا۔ یہ وقت اور

حالات کی دین تھی جس نے اسکول کی ٹیچری کو اس کا مقدر بنا دیا تھا۔ ورنہ اس نے تو بچپن ہی سے اپنی آنکھوں میں میڈیکل کی ڈگری کا حسین خواب سجایا تھا اور اس خواب کے سہارے وہ اکثر خوابوں کی دنیا میں خود کو دکھی مریضوں کا دکھ کم کرتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ یہ معصوم خواب اس کے سپنوں کی رہگزر پر گلاب کی مانند کھلے ہوئے تھے۔ وہ ان کی تعبیر پانا چاہتی تھی۔ مگر ان خوابوں پر اس کی بدنصیبی کے آنسوؤں کی شبنم بوند بوند بن کر گرنے لگی۔ نازک سی معصوم کلی جو ابھی موسم بہار کا پھول بھی نہ بن پائی تھی۔ بے موسم خزاں کی آمد نے اس کا سارا لہو نچوڑ ڈالا اور اس کی تمناؤں پر اماوس کی رات کی گہری سیاہ چادر تن گئی۔ اس کے احمریں لب جو کبھی مسرت اور شادمانی سے لبریز خوشیوں کے گیت گنگنایا کرتے تھے۔ ان پر درد و غم کا سوز مچلنے لگا اور اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں کا کاجل پھیل کر اس کے مقدر کی تاریکی بن کر اس کے پورے وجود پر پھیل گیا۔

کامن روم کی اس تنہائی میں اچانک ہی اس کے سامنے والدین کا وہ گھر گردش کرنے لگا جو کل تک کسی حسین گلدستے کی مانند سرسبز و شاداب تھا۔ اس گھر کے در و دیوار پاکیزگی کی خوشبو سے معطر تھے اور اب اس گھر کا تصور اس کے لیے ایک سہانا خواب بن کر رہ گیا تھا۔ اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے اس کے ابو کی تصویر ابھرنے لگی اور اس تصور سے اس کی شفاف آنکھوں کی گہری جھیل میں ایک خاموش ہل چل مچ گئی۔ پلکوں پر شبنم کے موتی لرزنے لگے جنہیں اس نے پلکوں سے نیچے گرنے نہیں دیا کیوں کہ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس بے رحم دنیا میں ان موتیوں کی کوئی قیمت نہیں۔ ابو کی یاد سے اس کے دل کی گہرائیوں کے اندر ایک ٹیس سی اٹھ گئی۔

ابو اپنے چھوٹے سے گھر کی کشتی کے لنگر تھے۔ تندرست و توانا، جاذب نظر، خوش مزاج، نرم گفتار اور انسانیت کے پیکر وہ اپنی گرہستی کی دنیا کے لیے ایک ایسی گھنیری اور آرامدہ چھاؤں تھے جس کے سایے تلے گھر کے سبھی افراد مسرتوں اور شادمانیوں کو گلے سے لگائے اپنی

اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے، مگر نہ جانے قدرت کو اچانک ہی کیا منظور ہوا کہ ایک رات سوتے ہی میں ابو کا ہارٹ فیل ہو گیا اور ان کے سارے کام ادھورے رہ گئے۔ ان کی بے وقت موت ایک ایسا ہولناک سانحہ تھی جس نے گھر کی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا۔ گھر میں ہر وقت گونجنے والی خوشیوں کے شادیانے اجل کی خوفناک وادیوں میں گم ہو گئے اور حنا کے دل کے اندر بسی ہوئی نوخیز تمنا، ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کی آرزو ابو کے ساتھ قبر کی مٹی کے اندر دفن ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی امی کی دنیا اجڑ گئی۔ ان کی کائنات لٹ گئی، سہاگ کا سرخ جوڑا اتر کر بیوگی کا سفید جوڑا ہمیشہ کے لیے ان کا مقدر بن گیا اور ہاتھوں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی کرچیاں آنگن میں جا بجا بکھیر کر ان کے نصیب پر نوحہ کناں ہو گئیں۔ حنا سبھی بھائی بہنوں سے بڑی تھی۔ اس لیے ان سبھوں کی ذمہ داری اس کے کمزور کاندھوں پر آ پڑی اور گھر کی ڈولتی ڈگمگاتی کشتی اس کے سہارے کی محتاج بن گئی۔

ابو کے انتقال کے بعد سے امی کی صحت مسلسل گرنے لگی۔ حنا اپنی ممکن بھر کوشش سے ان کا علاج کروا رہی تھی۔ مگر ان کے مرض میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس طرف ایک ہفتہ سے ان کی تکلیف اور بے چینی حد سے بڑھ گئی تھی۔ مگر دوا کے نام پر حنا کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ دواؤں کی خالی شیشیاں امی کے سرہانے پڑی تھیں اور ڈاکٹر کا تجویز کیا ہوا نسخہ ایک سوالیہ نشان بن کر حنا کے ذہن پر تازیانہ لگا رہا تھا۔ رات بھر وہ ان کے سرہانے بیٹھی رہ گئی تھی اور اس وقت اس تنہائی میں خیالوں کا ایک ہجوم تھا جو بار بار اس کے ذہن پر دستک دے رہا تھا۔ یادوں کی ایک کتاب تھی جس کے اوراق اس کے چاروں طرف منتشر ہو رہے تھے اور وہ کرسی کی پشت پر سر ٹکائے خاموش بت بنی ہوئی صرف ان یادوں کی پرچھائیوں کو اپنے اردگرد رینگتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے پیریڈ کی گھنٹی بھی اس کی سماعت سے ٹکرا نہ سکی اور نہ ہی اسے یہ احساس ہو سکا کہ اس اسکول کا ایک اور اسٹاف عامر کتنی دیر سے اس کے سامنے کھڑا اس

کی پلکوں پر لرزنے والے آنسوؤں کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے جس کو اس نے اپنے آتشیں رخساروں پر ڈھلنے سے روک رکھا تھا۔ عامر اس اسکول کا سب سے سنجیدہ اور باوقار اسٹاف تھا۔ یہاں اس کی علمی قابلیت پڑھانے کے دلنشیں انداز اور بردباری نے تمام لوگوں کے دلوں میں اس کی ذات کے لیے ایک عقیدت پیدا کر رکھی تھی کیونکہ اس کی سادگی اور کم گوئی اپنے اندر ایک ایسا وقار لیے تھی جس نے اس کی ذات کو انتہائی پرکشش بنا دیا تھا۔ یہ کشش اس کی سنجیدہ شخصیت پر ایک سحر کی مانند چھائی رہی تھی، مگر کامن روم کی اس وقت کی سوگوار فضا میں نہ جانے یہ حنا کی ملکوتی خدوخال کی جاذبیت تھی یا اس کی نرگسی آنکھوں میں بسا ہوا حسرت و مایوسی کا امتزاج جس نے عامر جیسی محتاط ہستی کو بھی اس کی طرف متوجہ ہونے کے لیے مجبور کر دیا۔ اور نہ جانے کیوں حنا کو اس وقت اس حالت میں دیکھ کر اس کے دل میں ایک انجانی ٹیس سی اٹھ گئی اور وہ سوچنے لگا کہ عورت کتنی معصوم بھولی اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ شرافت، مجسم شرم وحیا کی پتلی، تقدس کا پیکر اور عفت و عصمت کی مالک لیکن دنیا کے بازار میں اس کی قیمت کیا ہے۔ حنا نے جب یک بارگی اپنی بھیگی پلکیں اوپر اٹھائیں تو عامر کو اس طرح اپنی طرف دیکھتے پا کر سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گئی۔ اس ایک لمحے میں نہ جانے ایسا کون سا جادو تھا جس نے عامر کے جذبات میں ایک ہل چل مچا دی اور اس کا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ یہ دھڑکن کس جذبے کے تحت تھی وہ اسے کوئی نام نہ دے سکا وہ حنا کے سامنے والی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا اور انتہائی دھیمے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''حنا صاحبہ ذاتی سوال کرنے کا مجھے آپ سے کوئی حق تو نہیں ہے لیکن انسانیت کے ناطے کیا میں اتنا جاننے کا حقدار بن سکتا ہوں کہ وہ کون سا غم ہے جس نے آپ کے نازک وجود کو موسم سرما کی چاندنی بنا کر رکھ دیا ہے؟ گرچہ اس سے قبل حنا کو عامر سے بات کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس وقت اس کے لہجے کی گہری اپنائیت کو حنا نے اپنی روح کی گہرائیوں تک محسوس کیا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ عامر کبھی اس سے اس درجہ بھی سوال کرے گا۔

انسانی دل جب کسی شفقت اور ہمدردی کا جذبہ پاتا ہے تو آپ سے آپ پھوٹ بہتا ہے۔ حنا بھی اس وقت ان ہی جذبوں کی نذر ہو گئی اور وہ آنسو جنہیں وہ اب تک پلکوں کی راہ سے نہ نکلنے دینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ عامر کی نگاہوں کی محبت پاش گرمی پا کر ایک بارگی ٹوٹے ہوئے بندھ کی طرح بہہ نکلے۔ اس نے عامر کے سامنے اپنی زندگی کی کتاب کھول دی۔

''عامر صاحب میرے ابو کی بے وقت موت کی وجہ سے ہمارے گھر کے افراد ایک ایسے طوفان میں گھر گئے ہیں جہاں ایک طویل بے کسی اور یاسیت ان کا مقدر بن گئی ہے اور میں ان حالات میں گھر کر صرف شمع کی مانند جل رہی ہوں اور کچھ کر نہیں سکتی کیونکہ انسان اپنے حالات کے آگے اس درجہ بے بس ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامیوں پر صرف خون کے آنسو ہی بہا سکتا ہے۔ بس عامر نے اتنا سنتے ہی حنا سے دوبارہ کہا کہ حنا صاحبہ یہ ایک حقیقت ضرور ہے کہ ہر انسان کے دل کے اندر چند ایسی ناکام حسرتیں ضرور ہوتی ہیں جو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے بھی نہیں پاتیں اور راہ میں ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ مگر کیا اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ نہیں ہے کہ صرف غموں کو گلے سے لگا کر زندگی بھر بھٹکتے رہنا حاصل حیات نہیں ہوتا کیونکہ غموں کا سایہ انسانی زندگی پر وقتی بادل کی طرح چھاتا ضرور ہے مگر یہ دائمی نہیں ہوتا اور اس راہ کا سفر ہمت و استقلال کے ساتھ طے کر لینا ہی عزم و ہمت کی دلیل ہے۔ اگر اس کائنات میں انسان ہی خود مختار ہو جائے تو کوئی آرزو، حسرت ناتمام نہ کہلائے۔ عامر نے پہلی مرتبہ حنا سے کافی دیر تک اس موضوع پر بات کی۔ یہاں تک کہ فرصت کی گھنٹی بج گئی اور سبھی نے اپنے اپنے گھروں کی راہیں لیں۔ اس روز تنہائی میں حنا کو ایسا لگا کہ جیسے عامر کی باوقار اور شائستہ سی گفتگو نے اس کے دل کا بوجھ بہت کچھ ہلکا کر دیا ہے اور اب وہ غموں کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا نہیں رہ گئی ہے۔ خلوص اور اپنائیت کی اس ڈور نے بہت ہی جلد ان دونوں کو دوستی کی ڈور سے باندھ دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی ملاقاتیں بڑھنے لگیں اور بڑھتی ہوئی ملاقات نے اس دوستی کو محبت کے رنگ میں رنگ دیا۔ بہت ہی جلد عامر حنا کے گھر آتے جاتے

اس کے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ گھل مل گیا۔ عامر کی آمد و رفت سے اس گھر کے مکینوں کی مرجھائی ہوئی کلیاں پھر سے کھل اٹھیں۔ امی کے بے چین دل کو گویا ایک قرار سا مل گیا۔ گڈو، پپو، منی اور گڑیا کے نازک کومل وجود پر عامر کی ہنس مکھ شخصیت نے ایک توانائی پیدا کر دی اور حنا کا دل موسم بہار کے نرم و لطیف جھونکے کی طرح جھوم اٹھا۔ حنا کی امی جب عامر کو بچوں کے درمیان گھرا ہوا پاتیں تو کبھی کبھی انہیں اس کے اندر اپنے مرحوم شوہر کی شبیہ نظر آنے لگی۔ اس کی بیشتر عادتیں حنا کے ابو سے ملتی جلتی تھیں۔ بات کرنے کے دوران لبوں پر خفیف سا تبسم اور کبھی معمولی سی کسی بات پر دیر تک قہقہے لگانا۔ ان باتوں کی جھلک جب بھی وہ عامر کے اندر پاتیں تو دیر تک ان کا ذہن بھٹکتا رہتا اور جب وہ رات کی تنہائی میں سونے کے لیے بستر پر جاتیں تو نیلگوں آسمان کی وسعتوں کی گلکاری کو بڑی دیر تک تکتی رہتیں۔ انہیں ایسا لگتا کہ جیسے ستاروں کے درمیان ایک بڑا ستارہ ان کی نظروں کے سامنے جھلملا رہا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آسمان کی وسعتوں میں کہیں گم ہو جاتا اور پھر گئی رات تک ان کا دل اس بات کی گواہی دیتا رہتا کہ عامر اس بے رحم دنیا میں جینے والا وہ انسان ہے جو دوسروں کے لیے زندہ رہنے کا خواہاں ہے۔ اس کا دل ان انمول جذبوں سے لبریز ہے جو کسی کی خوشیاں نہیں چھین سکتا بلکہ کسی کا سہارا بن کر خود کو بے نام رشتوں کی صلیب پر نثار کر سکتا ہے۔ اسے اس بات کی پرکھ ہے کہ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو قرب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے آپ بن جاتے ہیں۔ یہ رشتے اٹوٹ ہوتے ہیں اور ان رشتوں کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

عامر کے گھر میں قدم رکھتے ہی گڑیا اور منی اس سے لپٹ جاتیں ''عامر بھائی ہمارے اسکول کے سارے سوالات غلط ہو گئے ہیں۔ ذرا بتا دیجیے۔'' گڈو کہتا ''عامر بھائی رات امی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کے یہاں چلیں گے؟'' پپو کہتا عامر بھائی وہ جو آپ نے ہمیں نئی حساب کی کتاب لا کر دی تھی اس کی جلد پھٹ گئی ہے۔ اسے درست کر دیں نا۔ عامر اپنے ہونٹوں

پر ایک دلنشیں مسکراہٹ بکھیرے ان تمام چھوٹے چھوٹے مسئلوں کو حل کرتا رہتا اور اس ماحول میں گھرا ہوا وہ تقدس سے بھر پور رحمت کا ایک فرشتہ نظر آتا۔ مسکراہٹوں اور قہقہوں کے درمیان گھر ہوا ایک ایسا سراپا جو محبت، انسانیت اور ہمدردی کے تاروں سے بنا ہوا ہو۔ ان لمحوں میں حنا کا دل اس کے وجود کو اپنی روح کی گہرائیوں میں سمیٹنے کے لیے چپکے چپکے بے چین ہو اٹھتا مگر وہ اپنی اس دبی آرزو کا اظہار اس کے سامنے نہ کر پاتی۔

ایک رات حنا کی امی پر بے ہوشی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ اس روز عامر کو یہ احساس ہوا کہ اب وہ قدرت سے مزید جنگ کرنے کے قابل نہیں رہ گئی ہیں۔ چنانچہ اس نے نہایت ہی سادگی کے ساتھ اسی روز حنا کے سامنے اپنے دل کی تجویز رکھ دی ''حنا میں محبت کے ساتھ تمہاری شخصیت کا احترام بھی کرتا ہوں۔ اس لحاظ سے تمہارے گھر کا ہر وہ فرد بھی میرے لیے قابل احترام ہے جس کی ذات تم سے وابستہ ہو، بلکہ اب میں یہ بھی سمجھنے لگا ہوں کہ جیسے تمہارے ساتھ میرا بھی ان پر کوئی حق ہے۔ لہٰذا اگر تم اجازت دو تو میں اس ضمن میں تمہاری امی سے بات کروں کہ کیا وہ مجھے اپنی فرزندی میں لینا پسند کریں گی؟ حنا عامر کے سامنے زبان سے تو اپنے دلی جذبات کا اظہار نہ کر سکی لیکن اس کے گلنار چہرے کی رنگت نے عامر سے اس کے دل کی بات کہہ دی۔ دوسرے دن عامر نے حنا کی امی کے سامنے اپنی دلی تمنا کا اس طرح اظہار کر دیا ''والدین کا سایہ کیا ہوتا ہے۔ یہ میں کبھی نہ جان سکا کیونکہ میرے سبھی اپنے ایک ایک کر کے اس دنیا سے اٹھ گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ زندگی کے گزرنے والے اتنے سالوں کے درمیان میں نے خود کو ہمیشہ ریگستان میں اگے اس تنہا درخت کی مانند پایا ہے جس کے چاروں طرف صرف ریت کا ایک دریا نظر آتا ہے، پھر بھی زندہ رہنے کے لیے ہمیشہ رشتوں کا طلبگار رہا ہوں۔ ایسے رشتے جن میں بندھ کر خلوص اپنائیت اور چاہت بوند بوند امرت بن کر روح کی گہرائیوں میں تاحیات گھلتی رہتی ہے۔ حنا کی امی نے عامر سے اس کی تمام باتیں سن لینے کے بعد بہتے ہوئے آنسوؤں کے

درمیان صرف اتنا ہی کہا ''بیٹا حنا کے ابو کی اچانک موت نے ہمیں زندگی کی اس ڈگر پر لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ اب ہماری کوئی استطاعت نہیں رہی۔ اس لیے بیٹا میں یہ کس طرح کہوں کہ جہیز کے نام پر تمہیں دینے کے لیے ہمارے پاس اپنے غموں کے سوائے اور کچھ بھی نہیں جنہیں ہم کلیجے سے لگائے بس کسی طرح جی رہے ہیں۔''

عامر کے سنجیدہ چہرے پر پل بھر کو ایک چمک ابھری اور اس نے کہا ''امی جان آپ لوگوں کے وہ سارے درد وغم میں انمول جہیز سمجھ کر اپنی جھولی میں سمیٹ لوں گا۔ عامر کے ان عظیم الفاظ نے انکی زندگی کا ایک بڑا بوجھ کم تو ضرور کر دیا مگر انہیں لگا کہ جیسے عامر نے ان سے ان کی اہمیت چھین لی ہو مگر گردش حالات کا تیز دھارا ان کے اس مبہم خیال کو بہا کر بہت دور لے گیا۔

☆☆☆

سہاگ کا ٹیکہ

قمر درد و غم کی ایک تصویر بنی ہوئی کھلے ہوئے دریچے سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اسکی بکھری سی حالت گردش زمانہ سے مرجھایا ہوا چہرہ اور بڑی بڑی معصوم آنکھیں، اس کی بے بسی کا فسانہ سنا رہی تھیں۔ اس کی مغموم نگاہیں دریچے سے باہر بہتے ہوئے دریا پر ٹکی ہوئی تھیں، جس کی لہریں کاروں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس لوٹ رہی تھیں، انہیں دیکھ دیکھ کر قمر کے دل کے اندر ایک دھواں سا اٹھ رہا تھا اور اس کا دل ان تڑپتی ہوئی موجوں سے اپنے اندرونی طوفان کا موازنہ کر رہا تھا۔ قمر جس جگہ دریچے سے سر ٹکائے کھڑی تھی اس کے تھوڑے ہی فاصلے پر بیحد میلے اور کثیف سے بستر پر اس کی ماں کا بیمار ڈھانچہ کسی زندہ لاش کی طرح چارپائی کی قبر کے اندر پڑا تھا۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا جن میں بلا کا کرب نمایاں تھا۔ قمر کی ماں ایک عرصے سے بیمار تھی اور مناسب علاج نہ ہونے کی صورت میں اس کا مرض آخری اسٹیج پر پہنچ چکا تھا۔ اپنی شفیق ماں کی یہ ابتر حالت دیکھ کر قمر کے دل و جگر پر آرے چل رہے تھے۔ اور دل خون ہو ہو کر آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں کی راہ سے بہہ رہا تھا۔ اپنی مجبوری اور بے چارگی پر وہ سوائے

اشکوں کا دریا بہانے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت اس کی ماں اس کے بالکل قریب بے ہوش پڑی تھی اور اس کا دل اس خیال سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا کہ وہ ماں آج اسکی نظروں کے سامنے بستر مرگ پر پڑی ہوئی اپنی زندگی کی بچی کھچی سانسیں پوری کر رہی تھی۔ جس نے تمام عمر اپنے بچوں کو اپنی آغوش محبت میں پناہ دے کر پروان چڑھایا تھا۔

تین بیٹے اور ایک بیٹی کی پیدائش کے بعد جب قمر کا باپ صرف چند ہی روز کی بیماری میں اپنے مالک حقیقی سے جاملا تو اس کی حوصلہ مند ماں نے اس بے رحم دنیا میں اپنے ننھے بچوں کی اس طرح پرورش کی کہ انہیں یتیمی کا احساس تک نہ ہوسکا۔ لوگوں کے کپڑے سی سی کر وہ خود اچھے کپڑوں سے محروم ہوتی چلی گئی۔ مگر بچوں کے لباس اس نے کبھی بے ترتیب ہونے نہیں دیئے۔ وہ تمام دن بھوکی رہ جاتی مگر اس کے بچوں نے کبھی فاقے نہیں کئے اور آخر اس نے حالات سے لڑتے لڑتے بچوں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنادیا۔

اس کوشش میں تمام عمر مصائب کا شکار رہتے رہتے وہ خود اندر ہی اندر بالکل ٹوٹ کر رہ گئی اور اس کا غم وکلفت سے چھلنی سینہ مزید بار غم اٹھانے کے قابل نہ رہا۔ غموں کے بار سے اندر ہی اندر ٹوٹی ہوئی اس خستہ حال ماں کا اس دنیا میں واحد سہارا صرف اس کی بیٹی قمر تھی۔ بیٹوں کو اپنی گرہستی بسا لینے کے بعد ماں سے کوئی مطلب نہیں رہ گیا تھا، انہیں پڑھی لکھی ایڈوانس بیویاں مل گئی تھیں جن کی رفاقت میں کھو کر انہوں نے ضعیف ماں کو فراموش کردیا تھا اور ان کی ایڈوانس بیویوں کو بھی جاہل ساس کا ساتھ پسند نہیں تھا اور تو اور انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ موت اپنا خوفناک پنجہ کھولے ان کی بیمار ماں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

قمر اس وقت دریچے کا سہارا لے کر کھڑی تھی۔ اس کی پرنم آنکھوں کے سامنے ماں کی گزشتہ زندگی کے تمام واقعات کسی دردناک فلم کی طرح گردش کر رہے تھے۔ دفعتاً ہی اس کے دل کے اندر اپنے بھائیوں کے لئے نفرت اور حقارت کی تیز لہریں اٹھنے لگیں۔ ان کی کم ظرفی اور

لا پرواہی کا خیال آتے ہی اس کے دماغ کے اندر ایک لاوا سا پکنے لگا۔ جسم کی تمام رگیں پھٹی ہوئی سی محسوس ہوئیں اور دل چاہنے لگا کہ وہ اس وقت اپنے بھائیوں کے پاس جائے اور انہیں دنیا کے سامنے اچھی طرح ذلیل کر دے۔ اس کا ذہن پریشان تھا اور وہ عالم بے قراری میں بار بار ماں کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے قمر شاید اس درجہ پریشان نہ ہوتی۔ کیونکہ کچھ عرصہ قبل اس کی مالی حالت اچھی تھی۔ اس کا گھر آسودہ حال تھا اور ایک عرصہ سے اسکی ماں کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا، وقت بہت ہی مزے میں گزر رہا تھا اور قمر کی ماں اپنے بیٹوں کی لاپرواہی کے باوجود قمر کے ساتھ بہت خوش تھی۔ مگر اچانک ہی خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ناموافق حالات کی تیز و تند آندھی نے قمر کی گرہستی کو الٹ کر رکھ دیا۔ قمر کا شوہر ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتا تھا۔ ایک دن اس فرم میں آگ لگ گئی اور اس کے شوہر کی شان کی نوکری ختم ہوگئی۔ نوکری ختم ہوتے ہی اس گھر پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ پہلے تو ایک ایک کر کے گھر کے سامان بکے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے تمام زیوروں سے محروم ہوگئی۔ اور اب نوبت یہ تھی کہ وہ پیسے پیسے کی محتاج تھی۔ اس حالت میں مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے ماں کی بیماری بڑھتی چلی گئی اور اب وہ اپنی بیمار اور بے سہارا اماں کو تیزی سے موت کی طرف بڑھتے ہوئے صرف دیکھ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل وہ بچوں کے لئے باورچی خانے میں روٹیاں سینک رہی تھی کہ ماں کی کراہ پر توے میں روٹی چھوڑ کر بھاگی ہوئی آئی اور دیکھا کہ ماں پسینے میں تر بتر ہو رہی ہے۔ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی کہ دفعتاً وہ کسی وجہ سے بے ہوش ہوگئی۔ یہ دیکھ کر قمر کے قدم بری طرح لڑکھڑائے، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ سر بری طرح چکرانے لگا اور وہ دریچے کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔ اس حالت میں کھڑے ہو کر وہ نہ جانے کب تک دریا کی تڑپتی ہوئی موجوں کو دیکھتی رہی کہ ماں کو ہوش آگیا اور اس نے کراہ کر پانی مانگا۔ قمر نے سہارا دے کر ماں کو پانی پلایا اور دوڑتی ہوئی ڈاکٹر کے یہاں چلی گئی۔ ڈاکٹر نے پوری کیفیت سننے کے بعد دوائیں لکھ کر دیں۔ مگر نسخہ لے کر جب وہ

دوا کی دوکان پر گئی تو دام سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ قمر کی ماں صفیہ سے میری بہت ہی پرانی دوستی تھی۔ اس دیرینہ دوستی کے ناطے میں صبح شام اس کی خیریت دریافت کرنے اس کے پاس جایا کرتی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر میرا دل اندر سے کڑھتا اور جب میں اس کی کوئی مدد کرنا چاہتی تو اس کی خوددار فطرت یہ گوارا نہ کرتی کہ اپنی اولاد کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کا احسان لے کر دنیا سے رخصت ہو۔

ایک بار میں نے دبی زبان سے اس سے کہا ''صفیہ تم اپنے لڑکوں کو اپنی اس حالت کی خبر کیوں نہیں کرتی ہو، کیا ایسے وقت میں بھی وہ تمہاری خبر گیری نہیں کریں گے؟ یہ سن کر اس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ مایوسی کے لہجے میں جواب دیتی ''بہن اپنے بیٹوں سے میرا بس اتنا ہی رشتہ ہے کہ میں انہیں جنم دینے والی ماں ہوں بس''

معمول کے مطابق ایک شام جب میں صفیہ سے ملنے کے لئے گئی تو اسے دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ اب محض چند ساعت ہی کی مہمان رہ گئی ہے۔ میں اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور مجھے قریب بیٹھے دیکھ کر اپنا سوکھا ہوا کمزور سا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا، میں نے جب غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ میں نے جلدی سے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا اور اس نے ٹوٹے ہوئے لہجہ میں کہنا شروع کر دیا۔

''بہن میرا ایک کام کر دو اور وعدہ کرو کہ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرو گی۔'' میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے اس سے وعدہ کیا۔ جب وہ مطمئن ہو گئی تو اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے تکیے کے نیچے سے کچھ تلاش کیا اور وہاں سے ایک سونے کا ٹیکہ نکال کر میرے ہاتھوں پر رکھ دیا اور کہنا شروع کیا۔ ''یہ ٹیکہ میرے مرحوم شوہر کی یادگار ہے۔ شادی کی پہلی رات انہوں نے یہ ٹیکہ مجھے تحفہ میں دیا تھا۔ میں نے اسے تمام عمر اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز رکھا ہے۔ مشکل

سے مشکل حالات میں بھی اسے خود سے جدا نہیں کیا اور اب جبکہ اس دنیا سے میرا رخت سفر بندھ چکا ہے میں چاہتی ہوں کہ اپنی تجہیز و تکفین کا انتظام خود ہی کر جاؤں۔ قمر کی حالت تم سے چھپی نہیں ہے۔ وہ کس کس کے آگے ہاتھ پھیلائے گی؟ تم اسے مناسب قیمت پر بیچ ڈالو اور وہ روپے لا کر دیدو۔''

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے صفیہ سے وہ ٹیکہ لے لیا اور اس وقت میرے تصور کی آنکھیں صفیہ کا دلہن بنا ہوا چہرہ دیکھنے لگیں جب یہ جگمگاتا ہوا ٹیکہ سہاگ کی نشانی بن کر اس کی خوبصورت پیشانی پر چمکا ہوگا اور پھر یہ سوچ کر میری آنکھوں سے رکا ہوا اشکوں کا ایک طوفان اُمڈ پڑا کہ آج وہی جگمگاتا ہوا ٹیکہ اس کے کفن کے کام آنے والا تھا۔ صرف چالیس سالوں میں ہی حالات میں کتنا بڑا فرق پیدا ہو چکا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔

شام کو آکر میں نے صرف کاشان کو گھر میں دیکھا قمر ماں کی دوا لانے کے لے باہر گئی تھی۔ میں نے کاشان کی نظریں بچا کر ایک ہزار روپے صفیہ کے ہاتھوں میں رکھ دیئے جسے اس نے تکیے کے نیچے ڈال دیا۔ نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد قمر نے بڑی مشکلوں سے روپے کا بندوبست کیا اور دوائیں لے کر آئی مگر اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی ماں کو قے ہوئی اور اس کے ساتھ ہی خون کا ایک پرنالہ اس کی حلق سے ابلنے لگا۔ کاشان نے سہارا دیکر اسے لٹایا تو پتلیاں پھر چکی تھیں۔ قمر نے جب غور سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ جیسے ماں کی منجمد نگاہیں اس سے کہہ رہی ہیں۔

''بیٹی میں نے تجھے بہت تکلیف دی۔'' قمر کے منہ سے ایک دل سوز چیخ ابھری اور وہ چکرا کر زمین پر گر گئی۔ ماں کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ گھر میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ قمر نے اپنا منہ سر اور سینہ پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔

بیٹوں کو خبر ہوئی۔ وہ آئے ضرور مگر اس طرح جیسے غیر کی میت میں لوگ شرکت کی غرض

سے آتے ہیں۔ کاشان نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر اس وقت گھر میں دو چار سو تو کیا دو چار روپے بھی برآمد نہ ہو سکے۔ میں نے جب قمر کے سر پر دلاسہ بھرا ہاتھ رکھا تو وہ میری طرف دیکھ کر بھبھک پڑی۔ ''خالہ کفن۔'' میں نے اسے دلاسہ دیا ''بیٹی گھبراؤ نہیں تمہاری ماں بہت ہی عظیم تھی۔ اسے تمہارا دکھ معلوم تھا اس لئے وہ اپنی تجہیز و تکفین کا انتظام خود کر گئی ہے۔ لاش اٹھائی گئی۔ میں نے تکیہ کے نیچے سے وہ روپے نکال کر قمر کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔ قمر پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان نوٹوں کو تکنے لگی اور میں سوچ رہی تھی کہ مرنے والی اگر عظیم نہ ہوتی تو یہ آخری غم قمر کو لے ڈوبتا۔

☆☆☆

مٹی کے دیئے

لیڈی ڈاکٹر حشمت زیدی نے جب اپنی آخری مریضہ سے فرصت پائی تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ حشمت آج جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ چنانچہ پانچ بجتے ہی اس نے تمام کاغذات سمیٹے اور اپنے کو آٹر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اپنا کام تندہی کے ساتھ انجام دینے والی بہت ہی نازک اور خوبصورت سی یہ ڈاکٹر آج جلدی گھر اس لیے جانا چاہتی تھی کہ آج صبح ہی اس کی ممی اس کے گھر آئی تھیں۔ انھیں گھر میں تنہا چھوڑ کر وہ اسپتال چلی آئی تھی۔ وہ گھر پر اس وقت تنہا ہوں گی یہ خیال اسے بے چین کر رہا تھا۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتی ہوئی اسپتال کے کمپاؤنڈ سے نکل کر گیٹ پر رکشے کا انتظار کرنے لگی۔

ڈاکٹر حشمت نے اسی اسپتال میں اپنی پہلی پوسٹنگ جوائن کی تھی۔ نازک اندام کجراری آنکھوں والی پریوں کی طرح حسین یہ ڈاکٹر بہت ہی جلد اس اسپتال میں ہر دل عزیز بن گئی تھی۔ ڈاکٹر کے سفید یونیفارم میں ملبوس گلے میں اسٹیتھ اسکوپ ڈالے اور گورے گورے پاؤں میں کالی سینڈل پہن کر متبسم ہونٹوں کے ساتھ جب وہ اسپتال کے چکنے فرش پر کھٹ کھٹ

کرتی چلتی تو دیکھنے والوں کی نظروں میں اس کے لیے خود بخود پسندیدگی کا ایک جذبہ ابھر جاتا تھا۔اس وقت وہ اسپتال کے گیٹ پر رکشہ کی منتظر تھی کہ سامنے سے ڈاکٹر اصفی آتے ہوئے دکھائی دیے۔حشمت کو دیکھ کران کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک لکیر ابھر آئی اور انھوں نے اس کے قریب آکر کہا ''ہیلو حشمت کیا رکشہ کا انتظار کر رہی ہو؟ اگر تمہیں تکلیف نہ ہوتو میں تمہیں اپنے اسکوٹر پر چھوڑ آؤں''۔ڈاکٹر اصفی کی اس مسکراہٹ کو دیکھ کر حشمت کا خون کھول اٹھا اور اس نے بہت رکھائی کے ساتھ جواب دیا ''نو تھینکس میں رکشہ سے ہی جاؤں گی۔''

ڈاکٹر اصفی اس اسپتال میں حشمت کے آنے سے کچھ عرصہ قبل آئے تھے۔وہ بڑی ہی سلجھی ہوئی فطرت کے سادہ سے خوب رو انسان تھے۔حشمت نے جب یہاں جوائن کیا تھا تو وہ پہلی ہی نظر میں اسکی معصوم شخصیت کو اپنا دل دے بیٹھے تھے۔مگر حشمت کی انتہائی سرد مہری نے انھیں اپنے دل کا اچھوتا پیغام نظروں سے پہچانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔مگراس کی انتہائی بے رخی کے باوجود وہ جب بھی اس کی نرم شیریں آواز سنتے تو ان کے کانوں میں ترنم خیز گھنٹیاں سی بجنے لگتیں اور دل کے اندر کچھ بے نام جذبے بیدار ہو جاتے۔اس وقت ان کا دل بے اختیار یہ چاہنے لگتا کہ کاش وہ حشمت کے ساتھ ایک ایسی وادی میں چلے جاتے جہاں نرم و نازک دودھیا بگولوں کی رہ گزر ہوتی اور اس رہگزر پر وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آبشاروں اور چمن زاروں کے گیت گاتے ہوئے کہیں دور نکل جاتے۔مگران کے دل کے اندر چھپا یہ پاکیزہ جذبہ حشمت کی منجمد اور ساکت شخصیت سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔آج بھی وہ ان کی مخلصانہ پیش کش کو ٹھکرا کر اور اس کا ردعمل ان کے چہرے پر دیکھے بغیر رکشے پر بیٹھ کر چلی گئی تھی اور ڈاکٹر حشمت کی نگاہیں اس وقت تک اس رکشے کا تعاقب کرتی رہی تھیں جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا تھا۔

حشمت کا رکشہ اس کے کوآٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔می کے پاس بیٹھ کر گپ کرنے کے خیال کی خوشی کے ساتھ اسے ایک الجھن بھی گھیر رہی تھی۔اس الجھن کی وجہ یہ تھی کہ می نے جس خط

میں اسے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی اسی خط میں اپنے آنے کا منشا بھی لکھا تھا۔ ممی کے اُس منشا کا تصور ہی اس کے لیے تکلیف دہ بنا ہوا تھا۔ امی نے اسے لکھا تھا کہ وہ اب اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ یعنی اس کی شادی کر دینا چاہتی ہیں۔ حشمت اس بات کو بخوبی جانتی تھی کہ شادی کا مطلب ہے ایک مرد کے دامن سے ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو جانا اور ''مرد'' یہ وہ نام تھا۔ جسے اس نے کبھی لائق التفات نہیں سمجھا تھا۔ یہ مرد ہی کی تو ہستی تھی جس نے اس کی ممی کی زندگی میں ہر طرف اندھیرے ہی اندھیرے بکھیر دیئے تھے اور ان اندھیروں کی رہ گزر پر انھیں تنہا بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن امی تو عزم وعمل اور ہمت کا ایک پیکر تھیں۔ زندگی کی ویران اور تاریک راہوں میں ہمت وجرأت کا جلتا ہوا ایک چراغ جنہیں بادِ مخالف کے تیز وتند جھونکے گل نہ کر پائے کیونکہ زمانے کے عطا کردہ زخموں پر انھوں نے اپنی مستقل مزاجی اور ہمت واستقلال کے مرہم کے پھاہے رکھ لیے تھے۔ حشمت جب کوآٹر کے اندر داخل ہوئی تو ممی کو اپنا منتظر پایا۔ رات کے کھانے کے بعد جب وہ سونے کی غرض سے اپنے بستر پر لیٹی تو ممی بھی اس کے پاس کے بیڈ پر آکر لیٹ گئیں اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انھوں نے اس سے اپنا مدعا بیان کر دیا جسے سن کر اس کے پورے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی اور اس نے قدرے تلخی سے ممی سے کہا ''ممی آخر آپ ہمیں اس بندھن میں کیوں باندھنا چاہتی ہیں جس بندھن میں بندھ کر آپ کو خود کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ سن کر ممی نے اس کے سر پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے ہی سکون سے جواب دیا ''سن میری بچی یہ تو ماں باپ کا ایک فرض ہے جسے ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر بیٹی تجھے شاید یہ معلوم نہیں کہ اس بندھن میں بندھنے سے پہلے میں نے تجھے خود اعتمادی کے جس زیور سے سنوار دیا ہے اس کے رہتے ہوئے کوئی تجھے اندھیری رہ گزر پر دھکیلنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اپنی منزل کی تو آپ رہنما بن چکی ہے''۔ اتنا کہہ کر امی تو اپنے بیڈ پر چلی گئیں اور امی کے جانے کے بعد حشمت کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ مگر سونے سے قبل اس کے تصور میں

آج پہلی مرتبہ ڈاکٹر آصفی کا سنجیدہ مگر متبسم چہرہ ایک دم گردش کرنے لگا جسے دیکھ کر اس کے نازک لبوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی کرن بکھر گئی۔ پھر وہ مندتی آنکھوں سے نیند کی وادیوں میں کہیں کھو گئی۔

رات آہستہ آہستہ سرکتی چلی جا رہی تھی۔ مگر حشمت کی ممی کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ صاف شفاف سفید نرم بستر پر کروٹیں بدل رہی تھیں۔ سونے کا یہ کمرہ مدھم مدھم سبز روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ کھلے دریچے سے روح کو شگفتہ بنا دینے والی رات کی رانی کی بیل کی مہک کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ اس روح پرور بھینی بھینی خوشبو کے سہارے وہ سونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر کوشش کے باوجود نیند ان کی آنکھوں سے دور ہی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ بالآخر ماحول پر ایک بے کراں سناٹے کا راج طاری ہو گیا۔ اس سکوت افزا ماحول میں جب نیند کی دیوی ان سے روٹھی ہوئی تھی، نہ جانے کیوں اچانک ہی ان کے ذہن پر ماضی کی تمام یادیں ایک ساتھ دستک دینے لگیں۔ اس دستک کے زیر اثر انہیں ایسا لگنے لگا کہ جیسے کھلے ہوئے دریچے کے باہر کا خلا ان کے لیے ایسا اسکرین بن گیا ہے جس پر ان کی ماضی کی تمام دھندلی تصویریں ایک ساتھ کانپ رہی ہیں۔ ماضی کی دکھ بھری یادوں سے وہ ہمیشہ دامن بچانا چاہتی تھیں۔ وہ سوچتی تھیں کہ ان گھڑیوں کی یاد سے فائدہ ہی کیا جن میں ارمانوں اور حسرتوں کا خون جگہ جگہ سے بہتا ہوا نظر آتا ہو۔ اگر وہ کسی کو اپنی بیتی زندگی کی ان گھڑیوں کا حساب دینے بیٹھتیں تو اتنی ہی گھڑیاں بیتتی جتنے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہے تھے۔ خاص کر اپنی زندگی کے اس دردناک دن کو کسی قیمت پر یاد کرنا نہیں چاہتی تھیں جس دن انہیں اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا دی گئی تھی۔ اس وقت اس سزا کے یاد آتے ہی بالکل غیر ارادی طور پر ان کی نگاہوں کے سامنے وہ دلکش رات گھوم گئی جب وہ من موہنی سی دلہن بن کر اپنے شوہر کے گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ اس رات ان کے شوہر کامران نے ان کی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں اپنا مردانہ پرکشش چہرہ چھپا کر کہا تھا کہ وہ انہیں تمام عمر پھولوں کی رانی بنا کر رکھیں گے۔

اُس رات کے آنے کے قبل وہ میٹرک کی ہنستی کھیلتی ایک طالبہ تھیں۔ والدین کی سب سے چھوٹی اولاد ہونے کے سبب وہ سب کی منظورِ نظر تھیں۔ دنیائے شعور میں قدم رکھنے کے بعد سے زندگی اُن کے سامنے صرف پیار و شفقت کا بہتا ہوا ایک دھارا رہی تھی۔ کامران کی والدہ نے اسی وقت انہیں ایک تقریب میں دیکھا تھا اور اپنے دل میں اپنے بیٹے کے لیے شریکِ زندگی کے روپ میں قبول کرلیا تھا۔ وہ ساون کی ایک بھیگی بھیگی سہانی سی شام تھی جب کامران کی والدہ ان کے والدین کے پاس پیغام لے کر آئی تھیں اور ان سے انہیں ہمیشہ کے لیے مانگ لیا تھا۔

• جب انہوں نے اپنی نئی دنیا میں قدم رکھا تھا تو ساس کی شکل میں انہیں ماں کی ممتا ملی تھی اور شوہر کے وجود میں محبت کرنے والا شریکِ سفر، جن کی محبت بھری چھاؤں نے بہت ہی جلد والدین کا آنگن بھلا دیا تھا۔ محبت اور رفاقت کے سایے میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد انہیں ایک دن یہ احساس ہوا کہ ان کے وجود کے اندر ایک ننھی سی زندگی کے آثار ہونے جارہے ہیں۔ ساس کو جب اس بات کی خبر ملی تو انہوں نے انہیں ہتھیلی کا پھپھولا بنا لیا اور کامران کی نظریں ہر وقت انہیں پھولوں میں تولنے لگیں۔ انسان کی شخصیت میں جب پیار و محبت اور شفقت کی آمیزش ہوتی ہے تو حسن خود بخود ہی نکھر جاتا ہے اور وہ تو ویسے بھی حسین تھی۔ اس پر پیار کے رنگ اور ماں بننے کی حسین آرزو کی خوشبو نے ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے۔ کامران کی ماں پوتے کی آرزو میں بہو سے ہر وقت یہ کہتی رہتی تھیں، دلہن یہ نہ کھاؤ دلہن وہ نہ کھاؤ، دلہن اتنی تیزی سے مت چلو دلہن شام کے وقت آنگن میں نہ جاؤ۔ اُن مسرت بھرے دنوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے ایک شام بھولی بھالی سنہرے بالوں والی چاندسی بیٹی عطیہ کو جنم دیا۔ ننھی عطیہ بالکل کامران کی تصویر تھی۔ کامران نے اسے دیکھتے ہی اپنی گود میں سمیٹ لینا چاہا تو دادی نے پیار سے اسے ان کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا، میں نے اس کا نام عطیہ رکھا اب انشاء اللہ اس کے قدم کی برکت سے اگلی بار خدا مجھے پوتا عطا کرے گا۔ کچھ دنوں کے بعد ننھی عطیہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گئی۔

کامران کو اس پیاری پیاری گڑیا کے بغیر ایک پل بھی چین نہ آتا تھا۔ ابھی عطیہ مشکل سے چھ ماہ کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ساس نے دوبارہ بہو کے پیر بھاری ہونے کی خبر سنی۔ اس خبر کے سنتے ہی ان کی تمام تر توجہ پھر بہو کی جانب ہوگئی۔ نو ماہ کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک خوشگوار سی صبح کو انہوں نے پیاری سی گڑیا، یعنی ننھی نعمت کو جنم دیا۔ مگر نعمت کو جنم دینے کے بعد انھوں نے یہ بات بہت ہی شدت کے ساتھ محسوس کی کہ عطیہ کی پیدائش پر گھر میں جو مسرت کی ایک خاص لہر سی دوڑ گئی تھی نعمت کی پیدائش پر اس کا کہیں دور تک بھی نام ونشان نہ تھا۔ بظاہر کامران کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ تھی مگر انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ کامران جتنا پیار اور لگاؤ عطیہ سے رکھتے تھے اتنا نعمت سے نہ رکھتے تھے۔ صرف وقت اور حالات سے سمجھوتہ کر کے گھر کے سبھی افراد اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نباہ رہے تھے۔ وقت چند گام اور آگے بڑھا تھا کہ گھر میں ایک بار پھر یہ خبر گردش کرنے لگی کہ بہو کے پاؤں بھاری ہیں۔ اس خبر کے گردش کرتے ہی وہ ایک بار پھر ساس اور شوہر کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ مگر اس بار نہ معلوم کیوں ایک اندیشے ان کے دل میں اپنا گھر بنا لیا تھا اور وہ اس اندیشے سے اندر ہی اندر کانپتی رہتی تھیں۔ جب ان کے دل کی گھبراہٹ اور بے چینی حد سے بڑھنے لگتی تھی تو وہ جانماز پر بیٹھ جاتی تھیں اور دونوں ہاتھ بلند کر کے خالق کی بارگاہ میں آواز دیتی تھیں ''یا خدا اس بار تو مجھے ایک بیٹا عطا کر دے''۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ویسے ویسے ان کی ساس کی نگاہوں میں امید کی کرن بڑھتی جا رہی تھی اور وہ ساس کی ان نگاہوں کی امید افزا چمک سے اندر ہی اندر لرز کر رہ جاتی تھیں۔ آخر کار وہ گھڑی بھی آ ہی گئی جس کے تصور سے وہ کانپ جایا کرتی تھیں۔ اس گھڑی میں انہوں نے معصوم ذکیہ کو جنم دیا تھا جسے دیکھ کر ان کی ساس نے باہر جاتے ہوئے دروازہ اتنی زور سے بند کیا تھا کہ انہیں محسوس ہوا تھا کہ انکا کمزور اور ناتواں وجود اب ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ ذکیہ کی پیدائش کے بعد گھر کے اندر مکمل طور پر ایک تناؤ کی سی فضا قائم ہوگئی تھی۔ کامران اُن سے ایک دم بے زار نظر آنے لگے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت گھر سے

باہر گزرنے لگا تھا اور گھر میں رہنے پر وہ اکثر و بیشتر عطیہ کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے تھے۔ عطیہ غریب جو شروع سے ہی باپ کی محبت کی عادی تھی سہم کر ماں سے لپٹ جاتی تھی اور وہ اسے ممتا کے آنچل میں سمیٹ لیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اب اس گھر میں ان کے لیے ایک بھیانک ٹریجڈی وقوع پذیر ہونے والی ہے۔ یعنی ان کی ساس اپنے بیٹے کی دوسری شادی کر دینا چاہتی تھیں مگر کامران نے اس وقت اس حد تک نہیں سوچا تھا۔ اس وجہ سے ماں کے اصرار پر اکثر وہ خاموش رہتے تھے۔ وقت تیز قدموں کے ساتھ گزر رہا تھا کہ ایک مرتبہ وہ پھر امید سے ہو گئیں اور اس بار بھی حسب سابق گھر کی گھٹن بھری فضا میں آس اور امید کے چند چراغ جل اٹھے۔ امیدوں کے جلتے ہوئے اس چراغ کی مدھم سی روشنی میں ساس کی نگاہوں نے بہو کے خدوخال میں اپنے خاندان کے نام لیوا کو تلاش کرنے شروع کر دیا۔ ایسے ماحول میں سکون کے لیے انہیں صرف ایک ہی راستہ نظر آیا تھا اور وہ تھا مالک حقیقی سے دعاؤں کا۔ رات کی بھیانک تاریکی میں جب ساری دنیا نیند کی آغوش میں گم ہوتی وہ آنسوؤں سے بھرا ہوا چہرہ لیے خدا کی بارگاہ میں صرف ایک فریاد کرتی رہتی۔ ''اے معبود مجھے صرف ایک بیٹے کی ماں بنا دے، پروردگار مجھے برباد ہونے سے بچا لے، اے سب کی مرادیں برلانے والے سخی داتا میرے گلشن کو اجڑنے سے محفوظ رکھ۔ لیکن ان کی تمام دعائیں عرش سے ٹکرا کر واپس آ گئیں۔ شاید مالک نے بیٹیاں ہی پیدا کرنا ان کا مقدر بنایا تھا اور پھر اس وقت گھر میں ایک کہرام برپا ہو گیا جب ان کے یہاں چوتھی بیٹی حشمت پیدا ہو گئی۔ اس کی ساس جلی بھنی ہوئی اپنی اور اپنے بیٹے کی قسمت کو کوس رہی تھیں کہ نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب وہ اس منحوس کو بیاہ کر اپنے گھر لائی تھیں، ہائے یہ نامراد تو انکے خاندان کا چراغ ہی گل کر دینا چاہتی ہے''۔ کامران جو کچھ دیر قبل بچی کی پیدائش سے پہلے اپنی آنکھوں میں ایک امید افزا چمک لئے ان کے سرہانے بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ وہ آنکھوں میں نفرت اور بیزاری کی جھلک لیکر بچی کی طرف دیکھے بغیر اس تیزی سے کمرے سے

باہر نکل گئے تھے، جیسے قدرت کی اس تخلیق میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔ حشمت کی پیدائش کے ساتھ ہی کامران کی آخری امید دم توڑ چکی تھی۔ لہٰذا اپنی دم توڑتی اس امید کے ساتھ انھوں نے اس کے ارمانوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی، یعنی اپنی دوسری شادی کی منظوری انہوں نے اپنی والدہ کو دے دی کیونکہ خاندان کا نام لیوا بھی تو ضروری تھا۔ والدہ تو ذکیہ کی پیدائش کے بعد سے ہی بیٹے کی دوسری شادی کے لیے بضد تھیں۔ انہیں تو انتظار تھا صرف کامران کی رضامندی کا جو انہیں اب حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ کامران کی رضامندی کو ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ نازک سی نجمہ بیگم مسز کامران بن کر اس گھر میں آ گئیں۔ نجمہ کے گھر میں آتے ہی انہوں نے اپنی بچیوں کے ساتھ خود کو باورچی خانے کی کوٹھری تک محدود کر لیا۔ اگر کبھی کبھار وہ اپنی بچیوں کو لے کر آنگن میں بیٹھ جاتیں تو کامران ان کی طرف سے منہ پھیر کر گزر جاتے۔ ننھی حشمت کو تو انہوں نے دیکھا تک نہ تھا۔

وقت اپنے محور پر تیزی کے ساتھ گردش کر رہا تھا۔ انہوں نے خود کو اپنی بیٹیوں کی ذات میں اس طرح سے ضم کر لیا تھا کہ جیسے اس گھر میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چند ماہ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ نجمہ بیگم کے پاؤں بھاری ہونے کی خبر ساس کے گوش گزار کی گئی۔ اس خبر کے ساتھ ہی گھر میں ایک بار پھر وہی کہانی دوہرائی گئی تھی۔ نجمہ بیگم یوں بھی بالکل نازک سی موم کی گڑیا جیسی تھیں۔ شوہر اور ساس کی نازبرداریوں نے مل کر انہیں مزید چھوئی موئی بنا دیا۔ کامران کی والدہ جلد از جلد پوتا کھلانے کی خوشی میں مگن تھیں۔ اس وجہ سے وہ ایک پل کے لیے بھی نجمہ بیگم کو اپنی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہونے نہیں دیتی تھیں۔ ہاں کبھی کبھی ان کے ذہن میں ایک خوف ناک خیال زہریلے ناگ کی مانند سر اٹھا لیتا تھا کہ کہیں نجمہ کے یہاں بھی لڑکی پیدا ہوئی تو؟ لیکن وہ جلد ہی اس منحوس خیال کو اپنے دل سے جھٹک دیتیں اور اپنی امیدوں اور تمناؤں کے سہارے خوابوں کی ان وادیوں میں چلی جاتیں جہاں ایک گول مٹول پیارا سا بچہ باہیں پھیلائے ان کی جانب بڑھتا نظر

آتا مگر افسوس کہ نجمہ کے آنے پر بھی دل کی کلیاں نہ کھل سکیں اور نحوست کے سایے اس گھر کے در و دیوار پر حسب دستور چھائے رہے کیونکہ مقدر سے لڑنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ وقت آنے پر نجمہ نے جسے جنم دیا وہ بھی لڑکی ہی تھی۔ اس روز انہوں نے شوہر کا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا کیونکہ اس نحوست کا ذمہ دار بھی انہیں ہی ٹھہرایا گیا تھا۔ اپنے ناتواں وجود پر اس الزام کا بوجھ لے کر وہ دوبارہ اس چوکھٹ پر واپس آ گئیں جہاں سے ایک دن وہ شہنائیوں کی گونج کے ساتھ رخصت کی گئی تھیں اور رخصت کرنے والی آنکھوں نے ان پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کیے تھے۔ لیکن جب وہ دوبارہ اس چوکھٹ پر واپس آئیں تو حالات میں بہت بڑا فرق پیدا ہو چکا تھا۔ بابل کا وہ گھر ان کی پناہ گاہ نہ بن سکا بلکہ انہیں وہاں بھائیوں کے تلخ رویے، بھابیوں کے طنز آمیز جملے، بہنوں کی کج ادائی اور ماں کے زہریلے فقروں سے نوازا گیا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے ایک دن اپنے شوہر کے گھر کی طرح والدین کا گھر بھی چھوڑ دیا۔

اس کے بعد اتنی بڑی کائنات میں اس وسیع و عریض دنیا میں وہ اپنی چار معصوم بیٹیوں کے ساتھ بالکل تنہا رہ گئیں۔ اس وقت ان کے پاس ان بیٹیوں کے لیے ممتا کے آنچل کے سوائے کچھ نہ تھا اور انہوں نے اس آنچل میں ان کو اچھی طرح سمیٹ لیا۔ ایسے وقت میں ان کی ایک سہیلی ناز نے انہیں اتنا سہارا ضرور دیا کہ انہیں رہنے کے لیے اپنے بڑے مکان میں ایک کوٹھری اس شرط پر دے دی کہ وہ اور ان کی بچیاں اس کے گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹا دیا کریں گی۔ ان کے پاس گلے اور ہاتھ کے چند زیور باقی رہ گئے تھے جنہیں بیچ کر ناز نے انہیں ایک سیکنڈ ہینڈ مشین خرید وا دی اور پھر وہ مشین ہی ان کا مقدر بن گئی۔ جب وہ لوگوں کے ڈھیر سارے کپڑے لے کر مشین کے پاس بیٹھ جاتیں تو پھر انہیں کوئی ہوش نہ رہتا۔ ہاتھ کی صفائی کی وجہ سے ان کے سامنے کپڑوں کے ڈھیر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ زندگی کو ایک ڈگر مل گئی اور پھر درختوں کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرتے رہے، ان کی جگہ نئے پتے لیتے رہے، صبح شام اور شام رات کے پیکر میں

ڈھلتی رہی۔ دن مہینوں میں اور مہینے سال میں تبدیل ہوتے رہے مگر ان کی نگاہوں نے اس درمیان صرف اپنے سامنے رکھی مشین اور رنگ برنگے کپڑوں کے سوائے کچھ نہ دیکھا۔ یہاں تک کہ انہیں یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ خود ان کے وجود میں کتنا بڑا تغیر پیدا ہو چکا ہے۔ کالی رات کی طرح سیاہ بالوں میں چاندی کے نہ جانے کتنے تاروں نے اپنا جال پھیلا دیا ہے اور تندرست و توانا سڈول جسم کب کا ہڈیوں کے ایک پنجر میں منتقل ہو گیا ہے۔ ہاں ایک روز انھوں نے جب اپنی کمزور بینائی والی نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ان کی سب سے بڑی بیٹی عطیہ جوان ہو چکی ہے اور اپنی بی۔اے کی شاندار کامیابی کی خبر انہیں سنا رہی ہے۔ شوہر کے گھر سے نکلنے کے اٹھارہ سالوں کے بعد یہ ان کے دل کی پہلی توانائی تھی جو انہوں نے اس وقت محسوس کی تھی۔ اٹھارہ سالوں کے جلتے تپتے ہوئے دن گزارنے کے بعد شاید وہ بہار کا پہلا جھونکا تھا جو اس وقت ان کی خزاں رسیدہ زندگی پر پڑا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ان کی ٹوٹی کمر اور کمزور زندگی کو عطیہ کے دو جوان اور محنت کش ہاتھوں نے سمیٹ لیا۔ عطیہ نے اپنی فہم و فراست کے سہارے بہت ہی جلد ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر کی جگہ حاصل کر لی۔ عطیہ کے برسر روزگار ہو جانے کے بعد وہ تنہا نہیں رہیں کیونکہ اس کی سروس ان کے عزم و ہمت کی وہ پہلی سیڑھی تھی جس پر انہوں نے اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔ ان کی ڈوبتی ڈگمگاتی زندگی کی ناؤ کو ایک پتوار کا سہارا مل گیا تھا۔ ایک ایسے پتوار کا سہارا جسے انہوں نے شب و روز کی جان توڑ کوششوں اور لگن و ہمت سے حاصل کیا تھا۔

پھر جب وقت کے طائر نے پر پھڑ پھڑا کر ایک اڑان اور بھری تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی دوسری بیٹی نعمت نے ایم۔اے کرنے کے بعد عطیہ کے بھرپور تعاون سے ایک اسکول میں ہیڈ مسٹریس کی جگہ حاصل کر لی ہے۔ اس گھر کی سادگی شرافت اور عطیہ کی بے پناہ خوبصورتی سے متاثر ہو کر شہر کے ایک معزز گھرانے کے ہونہار لڑکے رضا کا رشتہ آیا۔ رضا کسی سرکاری بینک میں کلرک تھا۔ عطیہ کی شادی کے بعد ان کی منزل صرف چند گام ہی باقی رہ گئی تھی۔ وہ اپنی دو بیٹیوں

کی بیساکھی کا سہارا لیے ہوئے اپنے راستے پر رواں دواں تھیں اور آخر کار وہ وقت بھی آ ہی گیا جس کا کہ انہیں انتظار تھا۔ گھر کے چار افراد کی جان توڑ لگن اور عزم و ہمت نے ان کی زندگیوں میں مسرت اور کامرانی کے رنگ بھر ہی دیئے۔ ذکیہ گرلس کالج میں لکچرر ہوگئی اور حشمت نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرلی۔ اب ان کی زندگی کی رہگزر پر اُن بھیانک اندھیروں کا کہیں دور تک نام ونشان بھی نہ تھا۔ جو کبھی اُن کے شوہر نے انہیں بخشے تھے۔ ان اندھیروں کو تو انہوں نے دور کردیا تھا۔ اپنے اُن ننھے چراغوں کی مدد سے جنہیں مٹی کے دیئے سمجھ کر توڑ کر پھینک دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

اچانک ہی صبح کی اذان کے ساتھ ان کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور تب انہیں احساس ہوا کہ وہ رات بھر ماضی کی یادوں سے الجھی رہ گئی ہیں۔ انہوں نے کروٹ بدل کر ایک نظر سوئی ہوئی حشمت کے چہرے پر ڈالی۔ حشمت کے ہونٹوں پر نیند میں بھی مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ مطمئن انداز سے اٹھیں اور نماز کے لیے وضو کی چوکی پر جا بیٹھیں۔ نماز سے فارغ ہوکر انہوں نے حشمت کو بیدار کیا۔ ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ حشمت نے ناشتہ کیا اور تیار ہوکر اسپتال کے لیے روانہ ہوگئی۔ اسپتال میں جب آج خلاف معمول اس نے ڈاکٹر اصغی کو اپنی دلنشیں مسکراہٹ کے ساتھ ہیلو کہا تو انہیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ حشمت کے ساتھ نرم ونازک دودھیا بگولوں کی رہگزر پر چل نہیں رہے ہیں بلکہ پرواز کررہے ہیں۔ حشمت نے انہیں اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

بندے مجھے آواز دے

فضائے بسیط پر اللہ اکبر کی سحر آفریں آواز اذان صبح بن کر گونج رہی تھی۔ جن بندوں کے دل عبادت پروردگار سے معمور تھے وہ تیز قدموں سے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ ان نمازیوں میں احمد حسن بھی شامل تھے۔ احمد حسن صاحب کے گھر کی عورتیں بھی صبح کی نماز ادا کرنے کے لئے بیدار ہوگئی تھیں۔ صبح کی نماز کے بعد قرآن خوانی اس گھر کے ہر فرد کا معمول تھا۔

شریعت اسلام کی تمام خوبیاں احمد حسن صاحب کے خاندان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کے یہاں سبھی کا سینہ ایمان و آگہی کی روشنی سے منور تھا۔ شرافت اور اعلیٰ تہذیب ان کے خاندان کی خصوصیت تھی۔ اسلام جو خود کے اندر ایک باوقار کشش رکھتا ہے جو اللہ کی طرف سے عطا کیا ہوا حسین تحفہ ہے اس کے تمام اصولوں کو ان لوگوں نے دل و جان سے اپنا بنا لیا تھا۔

احمد حسن صاحب ایک سرکاری کالج میں لکچرر تھے۔ اس عہدے کا انتخاب انہوں نے اس لئے کیا تھا کہ وہ اس پیشے کو بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ درس و تدریس کو وہ ایک معزز کام سمجھتے تھے۔ مذہبی پابندیوں کے ساتھ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ وہ کالج کی تعلیم کو

ان کے لئے برا تصور نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی صباحت کو بی۔ اے تک کی تعلیم دلائی تھی۔ نماز روزے کی پابندی اور دینی کتب کا مطالعہ یہ تمام خوبیاں صباحت کی ذات سے وابستہ تھیں۔ بچپن ہی سے اس کا ذہن دینی تعلیم و تربیت کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ بی۔ اے کی کامیابی کے بعد صباحت کے لئے ایک اعلیٰ خاندان کے لڑکے شہیر کا پیام آیا۔ تھوڑی سی چھان بین کے بعد احمد حسن نے اس رشتے کو منظوری دے دی۔ ایک ماہ بعد وہ وقت آیا جب صباحت دلہن بنائی گئی۔ اس کی پلکیں بار حیا سے جھکی تھیں۔ اور دل نیک آرزوؤں کے موتی، حسین تمناؤں کے پھول اور امیدوں کی پر بہار کلیاں سمیٹ رہا تھا۔ بیش قیمت زیوارت اور دلہن کا لباس اس کے مثالی حسن کو ایک نئی تابناکی سے جگمگا رہا تھا۔ وہ جذبات کے ہجوم میں گھری تھی اور دل ہی دل میں اس نام کا ورد کر رہی تھی جو کچھ ہی ساعت کے بعد اس کی ذات سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہونے والا تھا۔

نکاح کے مقدس بول ادا کئے گئے اور وہ ہمیشہ کے لئے ایک اجنبی مرد کی امانت بنادی گئی۔ پھر وہ گھڑی بھی آگئی جب فولاد کا سینہ رکھنے والوں کا دل آنکھوں کی راہ سے پانی بن کر نکل جاتا ہے۔

سبھی کو روتا ہوا چھوڑ کر اپنی پرنم آنکھیں لئے وہ سسرال کی نئی دنیا بسانے چلی گئی۔ اس کی سسرال میں ہر طرف رنگ و نور کا ایک سیلاب رواں دواں تھا اور حجلۂ عروسی کی عطر بیز دنیا اس کی منتظر تھی۔ اسے ایک سجی سجائی مسہری پر بٹھا دیا گیا۔ اس مسہری کے چاروں طرف بیلے کے پھولوں کی لڑیاں جھوم جھوم کر اپنی بھینی بھینی خوشبو سے اس کا استقبال کر رہی تھیں۔ اس ماحول میں آکر اس کے سینے کے اندر مچلتی ہوئی دھڑکنیں اس دل آویز خوشبو سے ہم آہنگ ہو گئیں اور ایک انجانے ان دیکھے لمحے کے اس احساس سے اس کی چاندسی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ چند لمحے گزرنے کے بعد وہ کیف آور ساعت آگئی جس کی پرچھائیاں ہر کنواری لڑکی کی راتوں کو بے کیف کر دیتی ہیں۔

کوئی بہت ہی آہستگی سے اندر آیا اور اس کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔ وہ اپنے آپ

میں سمٹی چلی جارہی تھی کہ ایک دلنشیں آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے بار حیا سے جھکی ہوئی پلکیں اوپر اٹھائیں تو دیکھا کہ اس کا بے حد خوبرو اور اسمارٹ شوہر اس سے بڑے ہی پیار بھرے دلکش انداز میں کہہ رہا تھا۔

دیکھو صباحت میں نے اپنی زندگی کا بہت سارا وقت مغربی ممالک میں گزارا ہے اسی لئے میں ہندوستان کی فرسودہ رسم و رواج یعنی دلہن وغیرہ کا ڈھکوسلہ نہیں مانتا۔ اس لئے تم ان لوازمات کو اتار دو اور مجھ سے فری ہو جاؤ۔ انسان کو ہر اس بے جا تکلف سے انحراف کرنا چاہئے جو اس کے لئے تکلیف کا سبب بنتے ہیں۔

صباحت اپنے شوہر کے یہ خیالات جان کر حیران رہ گئی۔ اس کی سہیلیوں نے تو اسے دلہن بناتے وقت اس کے سامنے سہاگ رات کا کچھ اور ہی منظر پیش کیا تھا۔ بہر حال اس نے جو کچھ بھی سنا تھا وہ اس کے مجازی خدا کا حکم تھا اس لئے وہ خاموشی سے اٹھی اور دلہن کے تمام لباس اتار کر ایک ہلکا سا لباس زیب تن کر لیا۔ ہر طرح کے میک اپ سے بے نیاز اس سادگی میں بھی وہ ایک آسمانی حور لگ رہی تھی۔ جسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے اپنی تمام تر رنگینیوں سے سنوارا تھا۔ شہیر بت بنے اسے تک رہے تھے اور انہیں لگ رہا تھا کہ جیسے مہتاب کی کوئی شوخ کرن ان کے کمرے کے اندر آ گئی ہے۔ وہ بس ایک ٹک اسے دیکھے چلے جا رہے تھے اور ان کی گرم نگاہی صباحت کے وجود کو پگھلا رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھ لیا۔ شہیر بے حد دلکش تھے۔ نوشاہ کے لباس کے بجائے ہلکے پھلکے لباس میں ملبوس، سرمئی قمیص اور دودھ سا سفید پاجامہ شائد یہ بات انہیں معلوم تھی کہ مناسب لباس انسان کی شخصیت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

خوش آئند خیالات اور کیف پرور ماحول کے درمیان صباحت کی سہاگ رات خاموشی سے گزر گئی۔ ہنگامہ سحر نمودار ہوا۔ اور ہر طرف زندگی جاگ اٹھی۔ ولیمے کی رسم کے بعد وہ شہیر کے ساتھ اپنے میکے آ گئی اور کچھ عرصہ وہاں گزار کر سسرال واپس آ گئی۔ وہاں اس کے شب و روز ایک

نئے انداز سے گزرنے لگے۔ ابھی وہاں کچھ ہی دن گزرے تھے کہ رفتہ رفتہ صباحت کو ایک حیرت انگیز اور تکلیف دہ احساس ستانے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے سسرال کا ماحول مشرقی تہذیب سے زیادہ مغربی تہذیب سے متاثر تھا۔

ایک دن صباحت نے دیکھا کہ اس کی جوان اور کنواری نند زارا تیار ہو کر کالج جا رہی تھی۔ زارا ایک خوبصورت اور حسین لڑکی تھی۔ مگر مغربی طرز کے لباس اور لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے بالوں نے اس سے مشرقی حسن کی نزاکت چھین لی تھی۔ اس کے اندر ان اوصاف کا کہیں پر شائبہ تک نہ تھا جو ایک مسلم لڑکی کے تقدس کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کے چلنے اور بولنے کے انداز کو کسی طرح بھی مہذب نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جب زارا کالج چلی گئی تو صباحت نے دبی زبان سے اپنی ساس سے کہا۔

''امی جان آپ زارا کو برقعہ اوڑھ کر کالج جانے کے لئے کیوں نہیں کہتیں۔ اس نے جس طرز زندگی کو اپنا رکھا ہے اسے اسلامی رہائش تو کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیا یہ بے پردہ رہن سہن ہماری تہذیب کے شایان شان ہو سکتا ہے؟ بہو کی زبان سے اپنی بیٹی کے حق میں یہ جملے سن کر اس کی ساس کے چہرے پر خفگی کے آثار پیدا ہو گئے اور انہوں نے تیور بدل کر اس سے کہا۔

''دلہن تم ایک پڑھی لکھی تعلیم یافتہ لڑکی ضرور ہو مگر ہمیں افسوس ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تمہارے خیالات انتہائی دقیانوسی ہیں۔ جو جہالت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ زارا اس سال ایم۔ اے کرنے جا رہی ہے اور تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ باتیں اس دور اور زمانے کی نہیں ہیں۔ یہ باتیں اس دور کی ہیں جب لڑکیوں کو بے زبان سمجھ کر تعلیم دینا جرم سمجھا جاتا تھا۔ آج کا دور ترقی کا دور ہے۔ اس میں لڑکیوں کو اپنی شخصیت نکھارنے اور اسے اعلیٰ و ارفع بنانے کی پوری پوری آزادی دی جا رہی ہے۔

صباحت نے یہ سب کچھ بڑے تحمل سے سنا۔ اور پھر بہت ہی مدھم لہجے میں اپنی ساس

سے کہا ''معاف کردیں امی جان شائد مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تعلیم یافتہ ہونے کے لئے اور زندگی کی نئی قدروں سے آشنا ہونے کے لئے اب مسلمانوں کو اسلام نے بے پردگی کی اجازت دے دی ہے۔

اتنا کہہ کر صباحت اپنے کمرے کے اندر چلی گئی اور وہاں جا کر بے حد دکھی دل سے سوچنے لگی۔ افسوس کہ قسمت مجھے ان لوگوں کے درمیان زندگی گزارنے کے لئے لے آئی ہے، جن کے ضمیر اور دل و دماغ کے اندر کفر کی تمام تر طاقتیں اسلام کے روشن خدوخال کو مٹانے کے لئے بھرپور جدوجہد کر رہی ہیں۔ وہ کافی دیر تک خیالات کے تانے بانے میں الجھی رہی۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ شام کی چائے کے وقت گھر کے سبھی افراد ڈرائنگ روم کے اندر جمع تھے۔ وہاں سے قہقہے لگانے اور باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ بھی کچھ دیر کے لئے وہیں چلی گئی۔ وہاں اس نے دیکھا کہ اس کا سب سے چھوٹا دیور اشہر کسی فلم کے ڈائیلاگ کی نقل اتار رہا تھا۔ شاید یہ فلم وہ اپنے والد صاحب کے ساتھ دیکھ کر لوٹا تھا۔ وہ ڈائیلاگ اس ایکشن کے ساتھ بیان کر رہا تھا جیسا اس نے فلم میں دیکھا تھا۔ اس کے سبھی بڑے اس کی ایک ایکٹنگ پر خوش ہو رہے تھے اور اسے شاباشی دے رہے تھے۔

صباحت نے سب کچھ دیکھا اور خاموشی سے چائے بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ چائے پینے کے بعد جب سبھی لوگ ادھر ادھر ہوگئے تب اس نے تنہائی میں اشہر کو بڑے ہی پیار کے ساتھ اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا۔

اشہر بابو تم بہت ہی ذہین معلوم ہوتے ہو۔ فلموں کے ڈائیلاگ بہت جلد یاد کر لیتے ہو۔ اگر میں تم سے چند سوالات کروں تو کیا تم مجھے ان کے جوابات دو گے؟'' اشہر نے خوش ہوتے ہوئے سمجھا کہ بھابھی جان اس سے کسی نئی فلم کی معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اس لئے اس نے فوراً ہی کہا۔

''کیوں نہیں بھابھی جان آپ کسی بھی فلم کی کاسٹنگ یا ڈائیلاگ مجھ سے دریافت کریں میں آپ کو سب بتادوں گا۔ صباحت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مگر میں تم سے جو سوالات کروں گی ان کی نوعیت ان سے مختلف ہوگی۔ اچھا اشہر یہ بتاؤ کہ اللہ نے جنہیں اپنا آخری پیغمبر بنا کر اس دنیا میں بھیجا تھا۔ ان کا نام کیا ہے، ہم جس دین کے ماننے والے ہیں اس کے اصول کیا کیا ہیں؟ ہمارے رسول نے ہمیں جو کتاب دی ہے اس کا نام کیا ہے؟'' اپنی امید کے برعکس بھابھی سے اس قسم کے سوالات سن کر وہ ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھنے لگا اور پھر ان سے بغیر کچھ کہے وہاں سے اس طرح نکل بھاگا جیسے اسے نہ جانے کون سی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ گیا ہے۔

اسلامی طرز زندگی سے بیگانہ اس گھر میں رہتے ہوئے رفتہ رفتہ صباحت کا دم گھٹنے لگا۔ وہ گھر جہاں آرائش زندگی کا ہر سامان موجود تھا، قیمتی اشیاء کی بھرمار تھی وہاں اپنے رب کی یاد سے بیگانگی کا احساس صباحت کے وجود کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ وہ اس احساس سے مغموم رہنے لگی کہ وہ گھر جو اس کا اپنا گھر تھا وہاں چاندی کے سکوں اور بیش قیمت سامان کو اسی شان و وقار سمجھا جاتا تھا۔ عیش و عشرت سے پر اس دنیاوی زندگی کے سامنے یہاں کے لوگوں کے لئے اسلامی تعلیم کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ گھر کی شاندار لائبریری میں کتابوں کا ایک انبار رکھا گیا تھا۔ مگر یہ تمام کتابیں صرف فلمی میگزین اور انگریزی کے عشقیہ ناولوں پر مشتمل تھیں۔ گھر کی کسی الماری میں بزرگان دین کی سوانح عمریاں یا صوفیائے کرام کے کارناموں کی کتابیں نہ تھیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے منقش فریموں میں مشہور فلم اسٹاروں اور کرکٹ کھلاڑیوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ مگر ان عظیم شخصیتوں کی کہیں پر ایک بھی تصویر نہ تھی جن کے کارناموں کے سامنے کبھی وقت کی موج نے احترام کے ساتھ اپنا سر جھکایا تھا۔ ان کے تقدس کا کوئی ہلکا سا احساس تک اس گھر کے مکینوں کے دلوں میں نہ تھا۔

صباحت کو سب سے زیادہ رنج اور دکھ اس بات کا تھا کہ خود اس کا شریک حیات جو لندن سے ایک اعلیٰ سند لے کر لوٹا تھا وہ بھی اس دنیاوی رنگ میں بری طرح ڈوبا ہوا تھا وہ عجیب سی نظروں سے ان چہروں کی طرف خاموشی سے دیکھتی رہتی تھی۔ جن کے چہروں سے بیگانگی کا رنگ ٹپکتا رہتا تھا۔ اس کے لئے سخت حسرت اور افسوس کا مقام یہ تھا کہ یہ گھر ایک مسلمان کا ضرور تھا مگر یہ قرآن شریف اور جانماز جیسی نعمتوں سے محروم تھا۔ اپنے گھر کے طور طریقوں کے برعکس یہ متضاد ماحول آخر کار صباحت کے سامنے ایک چیلنج بن کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں تمام رات وی۔ سی۔ آر پر فلمیں دیکھی جاتیں اور صبح کی نماز کے وقت نیند کے مزے لوٹے جاتے۔ صباحت یہ سب کچھ دیکھتی اور اس کے نازک ہونٹوں پر ایک زہر خند پھیل جاتا۔ اس کی پیشانی پر ناگوار شکنیں پڑ جاتیں اور وہ تلخی سے سوچنے لگی اپنے شریک حیات کے متعلق جنہوں نے اسے اپنی شریک حیات بنانے کے لئے قرآن کریم کی مقدس آیتوں کا سہارا لیا تھا کیونکہ انہیں اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ تھا۔ اس لئے اس دعوے کے تحت وہ اس کا سہارا لئے بغیر کسی کی زندگی کے مالک نہیں بن سکتے تھے۔ یہ پروردگار کا ان پر کرم تھا کہ انہیں مسلمان ہونے کا شرف بخشا، ان کی شخصیت کو ہینڈسم اور پرکشش بنایا۔ دولت دنیا کے ساتھ عزت اور مرتبے سے نوازا۔ ان اوصاف کی بدولت وہ ایک شریف خاندان کے داماد اور ایک دیندار لڑکی کے شوہر بن گئے۔ ایک باحیا لڑکی کے سفینۂ حیات کا پتوار ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا گیا۔ مگر افسوس یہ کسی اور کو کیا سہارا دیں گے جنہیں خود اپنی منزل کا پتہ نہیں۔ انہیں تو نیک ہدایات کے لئے خود ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔

اور پھر ایک دن صباحت نے اپنے دل کے اندر ایک فیصلے کی گرہ باندھی...... میں اس گھر کے طور طریقے بدلنے کی کوشش کروں گی۔ اس فیصلے کے بعد اس نے وضو کیا۔ دو رکعت نماز ادا کر کے یہ دعا کی۔

"پروردگار تیرے حکم سے قسمت مجھے ان لوگوں کے درمیان لے آئی ہے جنہیں

ہمارے رسول کے بنائے ہوئے اصولوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس لئے اے پالنے والے تیرے حضور میں مجھ گنہ گار کی یہ حقیری التجا ہے کہ تو مجھے وہ ہمت اور طاقت عطا کر کہ میں اس گھر کے اندھیروں کو دور کر سکوں۔ اگر میری کاوشوں سے ان بھٹکے ہوئے لوگوں کے دلوں نے اسلام کے اصولوں کی رعنائیوں کو خود کے لئے قبول کر لیا تو میری یہ نیکی اور کاوش بے شک مرے نامہ اعمال کے لئے ایک بہترین سرمائے سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ اس لئے پروردگار اس آزمائش کے وقت تو میری مدد فرما تا کہ میں اس ناسازگار ماحول میں رہ کر بھی اسلامی تعلیمات پر اپنی گرفت مظبوط رکھ سکوں۔

نماز کے بعد اس کے دل کو کچھ سکون ملا اور وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔

ایک شام شہیر کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ اس نے صباحت کے ساتھ فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا اور اس سے تیار ہونے کے لئے کہہ کر گاڑی نکالنے چلا گیا۔ ادھر مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی۔ اس لیے صباحت نماز پڑھنے کے لئے چلی گئی۔ نماز پڑھنے کے بعد کافی دیر تک کلام پاک کی تلاوت کرتی رہی۔ اور جب اپنی جگہ سے اٹھی تو فلم کا کافی وقت نکل چکا تھا۔ شہیر کا سارا موڈ کرکرا ہو گیا تھا اور وہ صباحت پر بری طرح برسنے لگا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد صباحت نے کہا کہ میں نے آخر ایسا کون سا جرم یا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے آپ اس درجہ چراغ پا ہو رہے ہیں۔ شہیر نے اور بھی بھڑکتے ہوئے کہا۔

''تم نے میرا بنا بنایا موڈ چوپٹ کر کے رکھ دیا اور اس کے بعد الٹا مجھ سے ہی یہ سوال کر رہی ہو کہ میں نے کون سا جرم کیا ہے۔ کیا تمہارے مذہب میں شوہر کو ناخوش کرنا کوئی جرم یا گناہ نہیں ہے؟''

یہ سن کر صباحت کا لہجہ بھی کافی تلخ اور زہریلا ہو گیا۔ اس نے شہیر کو جواب دیا۔

''ایک مسلمان ہو کر آپ جس مذہب کو صرف میرا مذہب کہہ رہے ہیں کیا وہ آپ کا

مذہب نہیں ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آپ کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ خدا نے ہم مسلمانوں پر پانچ وقتوں کی نمازوں کو ہر شے پر اولیت بخشی ہے۔ اگر اس کے لیے میں نے بے جا سیر و تفریح سے گریز کیا تو میرے نزدیک یہ کوئی جرم یا گناہ نہیں ہے۔

اس طرح کھرا جواب سن کر شہیر بری طرح تلملا اٹھے اور مردوں کی انا کا اوچھا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے بولے۔ ''صباحت ایک بات کان کھول کر سن لو اگر تمہیں اس گھر میں رہنا ہے تو اس گھر کے طور طریقوں کو اپنانا ہوگا اور میرے حکم و ارادے کا پابند بننا پڑے گا۔''

ان کلمات کو سن کر صباحت نے بھی پختہ لہجے میں کہا۔

''آپ کی شریک حیات اور گھر کی بہو ہونے کے ناطے بے شک آپ کا حکم ماننا اور اس گھر کے طور طریقوں کو اپنانا میرا فرض ہے مگر صرف اس حد تک جس حد تک میرے دینی اور مذہبی جذبات مجروح نہیں ہوتے۔ میں ایک مسلم گھرانے کی لڑکی ہوں، میری پرورش بچپن سے ہی اسلامی طور طریقوں کے مطابق کی گئی ہے اس لئے مغربیت کے غیر اخلاقی نظریات کو میں نہ خود کے لئے پسند کرتی ہوں اور نہ آپ کے لئے۔ مجھے افسوس تو صرف اس بات ہے کہ آپ ایک مسلمان ہو کر بھی اسلامی طرز زندگی سے محروم ہیں۔ اس کے ذمہ دار آپ خود نہیں آپ کے والدین ہیں جنہوں نے آپ کو اس کی تعلیم دینا ضروری نہیں سمجھا۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں ایک آپ ہی ایسے نہیں ہیں بلکہ آپ جیسے نہ جانے کتنے بدقسمت ہیں جنہیں والدین نے دین اسلام کی تعلیم سے محروم رکھا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ گمراہی کے راستے پر گامزن ہو کر اسلام کی آفاقیت کو بدنام کر رہے ہیں۔ اپنی تہذیب، اپنی زبان یہاں تک کہ خود اپنی پہچان کو کھو رہے ہیں۔ اپنی پاکیزہ تہذیب پر کیچڑ اچھالنے کے ذمہ دار ہو رہے ہیں۔ یہ کتنی غیرت کی بات ہے کہ جو والدین اپنے بچوں کی شادیاں رچاتے وقت قرآن کریم کی آیات کا سہارا لینا نہیں بھولتے وہی اپنے بچوں کو اس کی تعلیم سے محروم رکھتے ہیں جس کی وجہ سے

وہ گمراہ ہوکر خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے ایمان کی کشتیاں جلا بیٹھے ہیں۔

اتنا کہتے کہتے صباحت کا گلا رندھ گیا۔ اور وہ اپنے کمرے کے اندر چلی گئی۔ صباحت کے کمرے میں چلے جانے کے بعد شہیر کافی دیر تک بت بنے اس جگہ کھڑے رہے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ نازک سی یہ لڑکی جو ابھی کچھ ہی دن قبل ان کی شریک حیات بنی تھی وہ اس طرح اپنی عالمانہ گفتگو سے ان کے ساتھ ان کے والدین کی کمزوریاں بھی ان کے روبرو بیان کر کے انہیں پشیمان ہونے پر مجبور کر دے گی۔

انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ صباحت کے سامنے بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ ان کا دل بھرا جا رہا تھا۔ کانوں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ان کے اندر کی کوئی ان دیکھی طاقت انہیں جھنجھوڑ رہی ہے۔ ان کا سر چکرانے لگا۔

اپنی اس ذہنی حالت سے چھٹکارہ پانے کے لئے انہوں نے گاڑی نکالی اور پارک میں تفریح کے لئے چلے گئے۔ مگر پارک کی دلفریب فضاء میں بھی ان کا دل نہیں لگا اور وہ باہر نکل کر بلاوجہ سڑک پر چہل قدمی کرنے لگے۔ سڑک کی دوسری سمت ایک مسجد تھی۔ شہیر اس وقت ٹہلتے ہوئے مسجد کے قریب چلے گئے اور اس کے باہری گیٹ پر کھڑے ہوکر اندر کا جائزہ لینے لگے۔ عشاء کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ اور لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنے نماز سے فارغ ہوکر باہر نکل رہے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں شہیر اس سے قبل کبھی نہیں آئے تھے۔ ان کی دنیا تو کلب سنیما ہال اور پارک تک محدود تھی۔ آج زندگی میں پہلی بار انہوں نے مسجد سے نکلنے والے نمازیوں کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر انہیں ایک خاص قسم کی چمک اور پاکیزگی نظر آئی جسے دیکھ کر ان کا ضمیر اچانک ہی خود بخود در وا اٹھا اور انہیں لگا کہ جیسے کوئی غیبی طاقت انہیں خود ان کے اندر سے آواز دے رہی ہے۔

تیری منزل وہ نہیں ہے جس پر تو بے فکری سے رواں دواں ہے۔ بلکہ تیری اصل منزل

وہ ہے جہاں تجھے اپنے رب کی قربت نصیب ہوگی۔ اب بھی وقت ہے پلٹ آ اور خود پر ایمان و آگہی کے دروازے کھول لے۔ تجھے زندگی کا عرفان حاصل ہو جائے گا۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے اور گاڑی اسٹارٹ کر کے گھر واپس آ گئے۔ صباحت سو چکی تھی اور انہیں بھوک بھی نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے صباحت کو نہیں جگایا اور کپڑے بدل کر بستر پر دراز ہو گئے۔ مگر نرم بستر کے باوجود ان پر ایک اضطراری کیفیت طاری رہی۔

آنکھیں بے خواب اور ذہن بے سکون رہا۔ شب کی ظلمت بڑھ رہی تھی اور اس کے ساتھ ان کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر صباحت کا تلخ اور زہریلا لہجہ اس کا انداز گفتگو ان کے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی ضرب لگا رہا تھا۔ جب انہیں نیند نہیں آئی تو وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور صباحت کی ناصحانہ گفتگو کے ذریعے اپنے [illegible]ب لی گہرائیوں کے اندر اترنے کی کوشش کرنے لگے۔ صباحت کے ادا کئے ہوئے الفاظ انہیں بار بار یاد آ رہے تھے اور اس یاد کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے ایک ان دیکھا نورانی دریچہ کھل رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے ذہن کی تمام گتھیاں ایک ایک کر سلجھ گئیں۔ اسلام کی حقانیت مکمل طور پر ان پر آشکار ہو گئی اور انہیں یہ احساس بری طرح جھنجھوڑ گیا کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی بندگی کو نظر انداز کر کے وہ بے شک اب تک ایک گناہ عظیم کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ صباحت کو اللہ نے ان کی شریک حیات بنا کر ان کے لئے سعادت دارین کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے اپنے قلب و جگر میں ایک طمانیت کی کیفیت محسوس کی اور جب کاروان شب کے رخصت ہونے کا وقت قریب آیا اور سپید سحر کی کرنیں اجاگر ہونے کے لئے بے چین ہونے لگیں تو اس وقت شہیر بھی اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی کی سب سے حسین صبح کا استقبال اس طرح کیا کہ جانماز بچھا کر شکر کا سجدہ ادا کیا اور پھر ہاتھ اٹھا کر خالق ارض و سماء کی بارگاہ میں اس طرح لب کشا ہوئے۔

''پروردگار مجھے سجدے کے آداب نہیں معلوم کیونکہ مجھے اپنے بزرگوں سے اس کی تعلیم نہیں ملی۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ میرا یہ ناتمام سجدہ تیری بارگاہ میں ضرور شرف قبولیت حاصل کرے گا۔ آج کا یہ دن میری زندگی کا سب سے انقلاب آفریں دن ہے۔''

یہ کہتے ہوئے ان کی بے خواب سرخ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ نہ جانے یہ آنسوان کی گزری زندگی کی بے راہ روی کی ندامت کے تھے یا اسلام کی پاکیزہ دولت پالینے کی خوشی کے۔

بہر حال پروردگار نے اپنے بندے کی درد بھری دعا قبول کرلی تھی۔

☆☆☆

سنگ ریزے

گھڑی کے الارم نے پانچ بجنے کا اعلان کیا اور میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ افروز کچن میں چائے بنانے میں مصروف تھی۔ آج اتوار کا دن تھا اور یہ دن ہم لوگ اپنے بچوں کے ساتھ گھر سے الگ شام اودھ کی رنگین اور حسین فضا میں گزارتے تھے۔ بچوں کے ساتھ ہماری یکجائیت قابل رشک ہے۔ پپو ہمارا بڑا لڑکا اور رخشی منی سی بیٹی ہے۔ یہ دونوں پھول سے بچے میری حسین شریک حیات افروز کی تصویر ہیں۔ ہمارا یہ چھوٹا سا خاندان مسرت اور شادمانی کی دنیا کی ایک حسین تصویر ہے کیونکہ قدرت نے مجھے زندگی کی ہر خوشی عطا کی ہے۔ میں اپنی زندگی میں غم و کلفت کے منحوس سائے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ قدرت نے اپنی فیاضی اور رحمت کا ایک بیش بہا تحفہ مجھے افروز کی شکل میں عطا کیا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی گھڑیاں مسرت سکون اور شادمانی کے ساتھ گزارنے کے لیے ایک اچھی شریک حیات کا ہونا ضروری ہے۔

بے شک میری شریک حیات ایک ہیرا ہے جسے دنیا سنگ ریزہ سمجھ کر ٹھکرا رہی تھی۔ میں نے اس انمول ہیرے کو ایک جوہری کی نظروں سے دیکھا پرکھا اور اس کی چمک دمک سے اپنی دنیا

کو منور کر لیا۔ دس سال کا عرصہ گزرا جب افروز میری زندگی کے سفر میں شریک ہوئی تھی۔ وقت کی گرد بہت سے گزشتہ نقوش کو ڈھانپ کر دھیرے دھیرے فنا کر دیتی ہے کی لیکن میری زندگی کا وہ لمحہ جب میں نے افروز کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا وہ میرے ذہن کے گوشے میں آج بھی اس طرح سے محفوظ ہے جیسے سیپ میں موتی۔

میں ایک ڈاکٹر ہوں اور تقریباً دس سال قبل لکھنؤ آ کر میں نے اپنا ایک پرائیویٹ کلینک کھولا تھا۔ اس وقت افروز کے چچا یہاں ایک بہت بڑے اور نامور وکیل تھے۔ ایک دن ہمارے کلینک میں آئے اور مجھ سے اپنے یہاں چلنے کی درخواست کی۔ ان کی لڑکی ریحانہ کی طبیعت خراب تھی اور وہ اس کا چیک اپ کروانا چاہتے تھے۔ میں ان کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ وکیل صاحب کا شمار شہر کے بہت بڑے وکیلوں میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے گھر کے اندر دولت کی شان و شوکت نمایاں تھی۔ میں نے ریحانہ کا چیک اپ کیا۔ معمولی سا موسمی فلو تھا لیکن بے بی پکاری جانے والی بی۔ اے کی طالبہ جو کسی طرح قبول صورت کہے جانے کی بھی مستحق نہ تھی وہ بری طرح بستر پر بچوں کی طرح ٹھنک رہی تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ دولت اور امارت کی گود میں پلنے والی اس لڑکی کی عادتیں والدین کے بے جا لاڈ و پیار نے بگاڑ دی ہیں۔ میں نے دوائیں لکھ دیں اور معمولی سی ہدایت دے کر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایڈوکیٹ صاحب نے چائے کے لیے اصرار کر کے روک لیا۔ میں از راہ اخلاق بیٹھ گیا اور گھر کے اطراف پر نظریں ڈالنے لگا۔ گھر کے رکھ رکھاؤ سے امارت کی شان تو ٹپک ہی رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایک شے سے خاص سلیقے اور نفاست پسندی کی جھلک بھی آ رہی تھی۔ میں گھر کے رہن سہن کے اس انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ میں بھی فطرتاً رکھ رکھاؤ میں سلیقہ پسند ہوں۔ میں ابھی کمرے پر پسندیدگی کی نظر ڈال ہی رہا تھا کہ سامنے کا پردہ ہٹا اور میری نگاہیں اس حسین و جمیل پیکر پر مرکوز ہو کر رہ گئیں جس کے ہاتھوں میں چائے کی ایک چھوٹی سی خوشنما پلیٹ تھی۔ میں ایک

ٹک قدرت کے تراشے ہوئے اس حسین شاہکار کو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی آسمانی حور تھی اور غلطی سے زمین پر اتر آئی تھی۔ میں نے بہت ہی مختصر سے وقفے میں اس کے پورے سراپے کا جائزہ لے ڈالا۔ بس وہ سنگ مرمر سے تراشا ہوا ایک حسین مجسمہ تھی جس پر سنگ تراش نے اپنے فن کے کمال کا تمام جوہر صرف کر دیا تھا۔ سفید دودھیا رنگ کے ساتھ ہلکے گلابی رنگ کی آمیزش تھی اور سیاہ گھٹاؤں کو شرما دینے والے بال انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ اس کے شانوں پر ادھر ادھر بکھرے تھے۔ قدرت کی صناعی کا یہ بہترین شاہکار کسی قسم کی زیبائش اور آرائش سے قطعی بے نیاز تھا۔ اس کی بھیگی بھیگی سی نگاہیں جب ایک لمحے کے لیے میری نگاہوں سے ٹکرائیں تو جیسے میں ان بڑی بڑی کالی آنکھوں کے سحر میں ڈوبتا چلا گیا اور مجھے ایسا لگا کہ ان آنکھوں میں ایک بے بسی تھی، ایک فریاد تھی۔ وہ آنکھیں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ شاید اپنی مظلومی اور بے بسی کی داستان۔ اس نے چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور جس خاموشی کے ساتھ آئی تھی اسی خاموشی کے ساتھ واپس چلی گئی۔ چائے پینے کے بعد میں وہاں سے واپس تو آ گیا مگر اب میری ذہنی حالت یہ ہو چکی تھی کہ نگاہوں کے سامنے ہر وقت دو سحر زدہ کالی آنکھیں گردش کرتی رہتی ہیں۔ وہ کالی آنکھیں جن میں ایک خاموش فریاد پنہاں تھی۔

میں نے ایڈوکیٹ صاحب کے اندرونی حالات کا پتہ لگایا تو میرے علم میں یہ باتیں آئیں۔ ریحانہ اور افروز دونوں چچازاد بہنیں تھیں۔ ریحانہ دولت و ثروت کی گود میں پلنے والی ایک بدشکل اور خودسر لڑکی تھی۔ ساتھ ہی انتہائی درجے کی پھوہڑ اور زبان دراز، لیکن وکیل صاحب چونکہ لاکھوں کی جائداد کے مالک تھے اس وجہ سے انہیں اس کے لیے شوہر خریدنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور انہوں نے اپنی دولت کے سہارے بہت ہی آسانی سے اس کی منگنی رحمٰن صاحب جج کے لڑکے کے ساتھ کر دی اور اس منگنی کے بعد انہوں نے اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے خرچ سے لندن بھیج دیا۔ افروز کے والد چونکہ ایک معمولی اسکول ماسٹر تھے اس وجہ سے

وہ اپنی بیٹی کے لیے ایک لاکھ کا سامان تو مہیا نہ کر سکے تھے لیکن انہوں نے اسے زیور تعلیم سے آراستہ کر دیا تھا۔ قدرت نے افروز کو حسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا اور ماں نے اس کو گھر داری اور حسن سلیقہ سے سنوارا تھا۔ مگر اپنی ان تمام خوبیوں کے باوجود افروز دولت کے پجاریوں کی نظروں میں ایک سنگ ریزہ ثابت ہوتی رہی اور ماں باپ اس کے ہاتھوں میں مہندی رچانے کی آرزو لیے ہوئے ابدی نیند سو گئے۔ والدین کے انتقال کے بعد افروز کو اس کے چچا نے اپنی سرپرستی میں تو لے لیا مگر وہ اس کی شادی پر اپنے پاس سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ خرچ کرنے کے حق میں نہ تھے کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی دولت حاصل کی تھی وہ ان کی اپنی محنت کی کمائی تھی۔ اس میں افروز کے باپ کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اس وجہ سے اس کی مغرور چچی اسے اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے ایک ملازمہ سمجھتی تھیں۔ وہ افروز کے ہی ہاتھوں کا سلیقہ تھا جو میں ان کے گھر میں دیکھ آیا تھا کیونکہ ریحانہ کی ناز برداری کے ساتھ ساتھ گھر کی تمام ذمہ داریوں کا بوجھ بھی افروز ہی کے ہاتھوں میں تھا جنہیں وہ اپنی چچی کی کڑوی کسیلی باتوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے نباہ رہی تھی۔ لوگوں کو ریحانہ کے منگیتر کے لندن جانے کا علم تھا چنانچہ شروع میں لندن جانے والے چند امیدواروں کے پیغامات افروز کے لیے بھی آئے مگر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ افروز کے علاوہ کوئی اور دولت ان کے ہاتھ نہ لگے گی تو آہستہ آہستہ اس کے لیے پیغاموں کا سلسلہ بند ہو گیا۔

افروز کی وہ معصوم اور بے بس نگاہیں میرے دل میں اپنا گھر بنا چکی تھیں اور میں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے والدین کی طرف سے پوری آزادی ملی ہوئی تھی۔ ہمارا گھرانہ قدامت پسند نہیں تھا لیکن عزت اور شرافت کی دل سے قدر کرتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے میرے اس قدم کو دل سے سراہا اور مجھے بخوشی اس کی اجازت دی۔ اسی درمیان مجھے ریحانہ کی شادی کا کارڈ ملا اور میں شرکت کی غرض سے وہاں گیا۔ ان کا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا اور لوگ جہیز کی فہرست بنانے میں منہمک تھے۔ میں اپنے خیالوں میں کھویا ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا

کہ اچانک ہی ملحقہ کمرے سے ایک گرجدار آواز میری سماعت سے ٹکرائی جو غالباً افروز کی چچی کی تھی۔ ''لے افروز یہ کپڑے پہن لے، گھر میں مہمان آنے والے ہیں۔ ان کے سامنے اس حیثیت سے مت آنا، ورنہ لوگ یہ سوچیں گے کہ ہمارا سلوک تیرے ساتھ اچھا نہیں۔'' اتنا کہہ کر اس کی چچی وہاں سے چلی گئیں اور اس کے بعد دیر تک کسی کی ہلکی ہلکی سسکی کی آواز میرے کانوں میں کسی پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اترتی چلی گئی۔ میرا دل تقریب میں بالکل نہ لگا اور میں بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے واپس چلا آیا۔ اس رات مجھ دیر تک نیند نہ آئی اور میری نگاہوں کے سامنے آنسوؤں سے بھیگا ایک مغموم چہرہ ابھرتا اور ڈوبتا رہا۔

ریحانہ کی شادی کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی میں نے افروز کے لیے اپنا پیغام بھیجا جو فوراً ہی منظور کر لیا گیا۔ شادی کی تقریب کو انجام دینے کے لیے امی اور بھابھی یہاں آ گئیں۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر سادگی کے ساتھ یہ تقریب انجام پا گئی اور معصوم افروز میری شریک حیات بن کر میرے گھر کی ایک فرد بن گئی۔ جس روز یہ شادی ہوئی تھی اس روز مجھے معلوم ہوا تھا کہ دنیا میں سکھ ہی سکھ اور آنند ہی آنند ہے۔ میں نے بے خودی کے عالم میں اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور خود کو مسرت کے دھارے میں بہنے کے لیے چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس حسین ترین لمحے میں میں نے اپنے خوابوں کا نچوڑ پا لیا تھا۔ وہ خوشگوار لمحہ ایسا تھا جس میں دنیا کے تمام ساز ایک ساتھ جھنجھنا اٹھے تھے، دو ہستیاں ایک ہو گئی تھیں اور ہمیں یہ پختہ یقین ہو گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر جی نہ سکیں گے۔

آج ہماری شادی کو دس سال کا طویل عرصہ ہو چکا ہے۔ افروز میرے دو پھول سے بچوں کی ماں ہے۔ میرا گھر اور میری زندگی اس کی پاکیزہ شخصیت کی بدولت رشک جنت ہے۔ میری ملاقات اکثر ریحانہ کے شوہر سے ہوتی رہتی ہے اور میں کبھی کبھی ریحانہ کے گھر بھی جایا کرتا ہوں۔ وہ گھر جو افروز کے سلیقے کی بدولت کبھی نفاست اور اعلیٰ گرہستی کا نمونہ نظر آتا تھا وہ اب بد سلیقگی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ریحانہ کی خودسر، ضدی اور مغرور فطرت کی وجہ سے اس کے شوہر اختر کی

زندگی اجیرن ہے۔ وکیل صاحب کی دولت کی چھاؤں اسے دلی سکون نہیں پہنچا سکی ہے۔ اس کے بچے بھی خودسر ماحول میں بگڑ چکے ہیں اور اختر کی زندگی کی اس شکست نے اسے اندرونی طور پر بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔ اپنی دولت کے زعم میں ریحانہ اسے خاطر میں نہیں لاتی، جس کی وجہ سے حالت یہ ہے کہ وہ اب ذہنی سکون کی خاطر کوٹھوں کا سہارا لیتا ہے اور ایک گونہ بے خودی کے لیے خود کو شراب کے نشے میں ڈبوئے رکھتا ہے۔ مگر میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا یہ چیزیں انسان کو دل کی وہ خوشی دے سکتی ہیں جو ایک نیک سیرت شریک حیات کی پاکیزہ مسکراہٹ اور حسین باہوں کی پناہ میں اپنے گھر کے اندر ملتی ہے۔

☆☆☆

بدلتا ہے رنگ

موسم سرما کی ایک یخ سی شام ہے۔ سرمئی سرمئی اداس سا دھندلکا فضاء پر مسلط ہے۔
دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب نیلگوں سمندر میں غرقاب ہو رہا ہے۔ اس لئے رات کی ہلکی سیاہی
مغرب کی سمت رینگتی جا رہی ہے۔ آفس سے آنے کے بعد حسب معمول اپنے مخصوص دریچے پر
جا کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ اس دریچے سے رحمٰن صاحب کی کوٹھی صاف نظر آتی ہے۔ اس کوٹھی سے چند
نسوانی قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ گرچہ ہنسی کی یہ مترنم آوازیں کسی خوشحال گھر کی
خوشیوں بھری ساعتوں کی نشان دہی کرتی ہیں مگر یہ آوازیں میرے دل کے زخموں کو کھرچ ڈالتی
ہیں۔ میں ان کی ہنسی سے بری طرح تڑپ اٹھتا ہوں اور ذہن میں خود بہ خود یہ سوال اٹھنے لگتا ہے۔

اے وقت کے بے رحم سایو کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ ہم ان لوگوں کو جو ہمیں پیار کرتے
ہیں کھو دینے کے بعد کیوں روتے ہیں؟ ہم کسی کی ذات سے جھوٹی امیدیں کیوں باندھ لیتے
ہیں؟ پھر ان امیدوں کے ٹوٹنے پر کیوں افسردہ ہوتے ہیں؟ ہم وقتی حالات سے متاثر ہو کر ریت
کے گھروندے کیوں بناتے ہیں اور پھر ان گھروندوں کے ڈھے جانے پر کیوں تڑپتے ہیں؟

لیکن وقت کے بے رحم سائے کب کسی کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔ وہ تو دلوں پر انجانے ان چاہے نقوش چھوڑ کر گزر جاتے ہیں۔ وقت قدم قدم پر اپنی کیچلی بدلتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی زمین چاند اور ستارے بھی اپنا اپنا رنگ بدلتے ہیں۔ انسان تو صرف اس کے ہاتھوں کا ایک کھلونا ہے۔ جب سے اس کی زندگی شروع ہوتی ہے اور وہ بیدار ہوتا ہے۔ تب سے نہ اس کی اپنی کوئی صبح ہوتی ہے اور نہ کوئی شام ہوتی ہے۔ وہ سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ کیونکہ انسان کی حقیقت اس بحر بیکراں میں ایک حقیر تنکے کی مانند ہے۔ حالات کی لہریں جدھر چاہتی ہیں اس کا رخ پھیر دیتی ہیں۔ یعنی اگر کبھی انسانی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے کہ خوشیاں، مسرتیں اور شادمانیاں اس کی ذات کا جزو بن جاتی ہیں تو کبھی اس کی ساری امیدیں دم توڑ دیتی ہیں اور شادمانیاں آنسوؤں میں ڈوب جاتی ہیں۔ شام کے اداس اداس سناٹے میں میری نگاہیں رحمٰن صاحب کی کوٹھی پر ٹکی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں ان کی ان راہوں کے متعلق جہاں منزلیں کبھی خود آگے بڑھ کر مسافر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتی ہیں۔ مسافر ابھی قدم بڑھا بھی نہیں پاتا کہ اس کی منزل اس کے سامنے ہوتی ہے۔

آج رحمٰن صاحب کی کوٹھی کے اندر کیا نہیں ہے۔ شاندار بیڈ روم، بے حد قیمتی پلنگ، کھڑکیوں پر جھولتے ہوئے نفیس ریشمی پردے، دبیز قالین، نئے ماڈل کی بیش قیمت گاڑیاں، ہر چیز بدل چکی ہے۔ بلکہ اپنا اعلیٰ ترین روپ حاصل کر چکی ہے۔ مگر یہ کون جانتا ہے کہ وقت اگر کسی کی جھولی مسرتوں سے لبریز کر دیتا ہے تو کسی کو تہی داماں بھی کر دیتا ہے۔

یہ وقت ہی تو ہے جس نے رحمٰن صاحب کی زندگی کو بدلنے کے بعد مجھے تباہیوں کی دلدل میں دھکیل دیا ہے اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ ظلم کی تباہ کاریاں، ایک کھنڈر، ایک شکستہ وجود، ایک مجروح روح اور لہولہان دل، کوٹھی کے اندر سے بلند ہونے والی ہنسی کی آوازیں اس وقت میرے دماغ پر انگارے برسا رہی ہیں اور ایک بار پھر کتاب زندگی کے اوراق ذہن میں اٹھتی

آندھی کے بگولوں سے پھڑ پھڑا رہے ہیں اور ورق زندگی میری نظروں کے سامنے بکھرتی چلی جارہی ہے۔ وقت کے دوش پر یادوں کی پرچھائیاں دھیرے دھیرے رینگ رہی ہیں اور ماضی کی وادیوں میں ابھر رہا ہے ایک چھوٹا سا کچا مکان جس کے صاف ستھرے آنگن میں میرے پیار کی پھلواری تھی۔ میں اس گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا تھا۔ جس کے اندر کئی نیک طینت اور پرخلوص ہستیاں تھیں۔ ان کے دامن میں میرے لئے چاہت تھی، اپنائیت تھی، محبت تھی، پرخلوص جذبے تھے۔ شفقت اور ممتا کے سنہرے موتی تھے۔ وہ چھوٹا سا گھر حسن وسلیقے کی شیرینی سے معمور تھا۔ اس میں مشرقیت کے پاکیزہ پھولوں کی ہنستی مسکراتی، شرماتی، لجاتی کلیاں تھیں۔ سوچوں کے سہارے وہ تمام پیکر ذہن میں ابھر اور ڈوب رہے ہیں۔ پھر ان پیکروں کے درمیان نگاہوں کے سامنے ایک سراپا آکر منجمد ہو گیا ہے۔ ساکت رہ گیا ہے اور میں آنکھیں پھاڑے تصور کی دنیا میں اس سراپے کو حسرت سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ سراپا تانبہ کا ہے جو میری شکستہ زندگی کی آرزو تھی۔ میری چاہت کا حاصل تھی۔ اس کی شبنمی آنکھوں کی تازگی میری روح کی ٹھنڈک تھی۔

یہی وہ ہستی تھی جس کے بغیر آج میرا وجود ایک سایہ بن کر رہ گیا ہے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا بت، تانبہ سے ملنے کے قبل میں کیا تھا۔ ایک آوارہ بادل کا ٹکڑا جس کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے، نہ مستقبل، نہ کوئی اپنا، نہ پرایا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا خود کو سوتیلی ماں کے ظلم وستم کے شکنجے میں جکڑا ہوا پایا تھا۔

اس کے ظلم وستم کی گرفت جب جسم سے زندگی کا آخری قطرۂ خون تک نچوڑ لینے کے قریب تھی کہ میں نے ایک رات بھوک کی شدت سے بلبلاتے ہوئے وجود کو لے کر اس گھر کی چوکھٹ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔

سڑکوں پر بوٹ پالش کر کے پیٹ کی آگ کو روٹی کے چند ٹکڑوں سے بجھاتے ہوئے کسی نہ کسی طرح جوانی کی سرحد میں قدم رکھا۔ انہی دنوں قدرت کی مہربانی سے ایک مخلص انسان

کی قربت ملی۔ وہ فرشتہ صفت انسان اپنے آفس جاتے وقت روزانہ مجھ سے اپنے جوتوں پر پالش کروایا کرتا تھا جس کی وجہ سے مجھے اس کی چند منٹوں کی قربت حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ اس مختصری ساعت میں وہ مجھ سے میرے گزشتہ حالات کے متعلق جاننا چاہتا اور میری زبانی میرے دکھ بھرے حالات سن کر اظہار تاسف کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کی مختصری قربت اپنائیت کا رخ اختیار کر گئی۔

اور ایک دن اس فرشتہ صفت انسان کی انسانیت مجھے پیڑ کی چھاؤں سے اٹھا کر گھر کی چھاؤں میں لے گئی۔ اس کی نیکی، ہمدردی اور شرافت نے میرے دل سے ماضی کے تمام زخموں کو کھرچ ڈالا۔ اس کے زیر سایہ میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور پھر اس کی بدولت ہی ایک آفس میں کلرک کی جگہ مل گئی۔

زندگی کو ایک نئی ڈگر مل چکی تھی اور میں اس پر رواں دواں تھا کہ ایک دن اچانک ہی اس نیک ہستی نے اس دنیا سے سدا کے لئے اپنا ناطہ توڑ لیا۔ مگر اپنی موت سے قبل اس نے مجھے سماج میں ایک باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اس کی موت کے بعد میں نے اس محلے میں ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے لیا۔

وقت کا کارواں رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگا۔ اس محلے میں رہتے رہتے میری معمولی علیک سلیک جہاں زیب سے ہوگئی۔ جہاں زیب ایک پرائیویٹ فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس کے والد رحمٰن صاحب انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے پروویڈینٹ فنڈ کی رقم سے ایک معمولی سا چھوٹا مکان رہائش کے لئے خرید لیا تھا۔ ان کی پینشن کی قلیل رقم اور جہاں زیب کی تنخواہ پر گھر کی گزر بسر ہوتی تھی۔

جہاں زیب سے میری پہلی ملاقات شہر کے ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں، میں اس کی وجیہہ شخصیت سے متاثر ہوئے بغیرہ نہ رہ سکا۔ کیونہ وہ مردانہ حسن و وجاہت کا ایک نمونہ تھا۔ اس کی نرم گفتاری اور رہن سہن کے سلیقے نے اس کی ذات کو ایک خاص

کشش اور خوب صورتی عطا کی تھی۔ یعنی وہ ظاہری اور باطنی حسن کے خزانہ بیش بہا سے مالا مال تھا۔ والدین کی اعلیٰ تعلیم و تربیت نے اس کا انداز تکلم مرعوب کن حد تک خوبصورت بنایا تھا۔ اسلام کے مقدس اور پاکیزہ اصولوں کی پابندی نے اس کا کردار سنوارا تھا۔ انسانیت اور خوش خلقی نے اسے سب کا منظور نظر بنا دیا تھا۔ پھر میں اس کی شخصیت سے کس طرح متاثر نہ ہوتا۔

چنانچہ میرا زیادہ تر وقت اس کے قریب گزرنے لگا۔ آفس کے بعد میں اس کے گھر چلا جاتا اور وہاں سے گئی رات کے بعد واپس آتا۔

مجھے جہاں زیب کے والد میں باپ جیسی شفقت اور والدہ میں ماں کی ممتا کی مٹھاس کا احساس ہوتا۔ اس کی تین جوان بہنیں تھیں، ثانیہ، نادیہ اور فوزیہ۔ یہ تینوں لڑکیاں شادی کے قابل تھیں۔ جہاں زیب کا گھر مشرقی ماحول اور اسلامی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ تینوں لڑکیاں سادگی اور معصوم حسن کا جیتا جاگتا پیکر تھیں۔ سرو قد، متناسب اعضاء، لمبے لمبے بال۔ ان کے چہروں پر فرشتوں جیسا تقدس تھا۔ چھوٹا سا گھر جہاں پیسوں کی فراوانی تو نہ تھی لیکن وہ گھر سلیقہ، سادگی اور صفائی کے لئے اپنی مثال آپ تھا۔ کوئی ریاکاری، کوئی بناوٹ نہیں۔ ہر شے تصنع سے پاک اور ہر جذبہ مکر و فریب سے بے نیاز، اس گھر کا ہر فرد محبت اور انسانیت سے بھرپور وجود کا حامل تھا۔ نماز، روزے، مذہب و شریعت کے اصولوں پر مبنی احکام کا پابند، نماز صبح کے بعد گھر سے آتی ہوئی قرآن پاک کی تلاوت کی مسحور کن آوازیں دلوں میں ایمان و آگہی کی روشنی پیدا کرتی تھیں اور سر خود بخود عقیدت سے جھک جایا کرتا تھا۔

رمضان کے مبارک مہینے میں ایسا لگتا تھا کہ رحمت کے فرشتے اس گھر کی برکتوں کے لئے پروردگار سے دعا گو ہیں۔ اس خاندان کی بے مثال خصوصیت نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ کاش انسان کے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ وہ وقت کے ان لمحوں کو پکڑ کر قید کر لیتا جو اس کی زندگی کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں تو میں اپنی زندگی کے ان لمحوں کو جو میں نے

جہاں زیب کے خاندان کے ساتھ گزارے تھے، قیمتی موتی کی طرح بند کر لیتا۔ چونکہ وہ لمحے اپنائیت اور انسانیت کے لمحے تھے۔ محبت اور خلوص کے لمحے تھے۔ اور محبت وہ عظیم جذبہ ہے جو جینے کا انداز سکھاتی ہے۔ انسانیت کی قدر کراتی ہے۔ بڑے ہی خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں محبت ملتی ہے۔ ثانیہ کا معصوم حسن، اس کی بھولی صورت، اس کا پاکیزہ وجود میرے دل کی گہرائیوں میں بس گیا تھا۔

وہ بھی مجھے دل و جان سے چاہتی تھی۔ مگر اس کا اظہار زبان سے نہ وہ کر سکتی تھی اور نہ میں کر سکا تھا۔ صرف ایک ان دیکھا جذبہ تھا۔ ایک نامعلوم خلش تھی جو انجانے میں ایک کو دوسرے سے قریب کر گئی تھی۔ میں اس کے مشرقی حسن کے سحر میں کھو کر رہ گیا تھا۔ اس کی معصوم چاہت نے مجھے یہ بھولنے پر مجبور کر دیا کہ میں زندگی کی راہوں میں تنہا ٹھوکریں کھانے والا ایک زخم خوردہ انسان ہوں۔ میں تو رفتہ رفتہ خود کو خوشیوں کا حقدار سمجھنے لگا تھا۔ مگر یہ خوش آگیں احساس دیرپا ثابت نہ ہوا۔ وقت بدل گیا اور اس نے مجھے یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ میں کل کیا تھا اور آج کیا ہو گیا۔

جہاں زیب جس فیکٹری میں کام کرتا تھا اس کے مالک کا شمار شہر کے بہت بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ ان کی کئی فیکٹریاں تھیں۔ نہ جانے کتنے ٹرک اور بسیں چلتی تھیں۔ کروڑوں کا بنک بیلنس تھا۔ ان تمام آسائشوں کے درمیان صرف ایک لڑکی صبا تھی جس کے لئے انہیں ایک ایسے لڑکے کی تلاش تھی جو داماد ہونے کے ساتھ ان کا ہونہار وارث بھی ہو اور دیانت داری کے ساتھ ان کا وسیع کاروبار بھی سنبھال سکے۔ اس مطلب کے لئے جہاں زیب کی باکردار شخصیت کو ان کی نظریں اکثر تولتی رہتی تھیں۔

ایک عرصہ سے وہ اسے دل ہی دل میں پرکھ رہے تھے۔ بہت دنوں کی جانچ کے بعد انہیں یہ پتہ چلا کہ سوائے دولت کی کمی کے جہاں زیب میں اور دوسری کوئی کمی نہیں تھی ان کے

پاس اپنی دولت بے شمار تھی۔ اس لئے انہیں جہاں زیب کے غریب ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ وہ ان کے معیار کی کسوٹی پر ہر طرح پورا اتر رہا تھا۔ لہٰذا خوب سوچ سمجھ کر انہوں نے اسے داماد بنانے کا فیصلہ کرلیا اور رحمٰن صاحب کے یہاں پیغام بھیج دیا۔ وہاں یہ پیغام فوراً منظور کرلیا گیا۔

رحمٰن صاحب کے چھوٹے سے مگر صوم صلوٰۃ کے پابند گھر پر اللہ کا ابر کرم ٹوٹ کر برسا اور قدرت اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ ساتھ اس خاندان پر مہربان ہوگئی۔

کچھ دنوں تک شادی کی کافی ہماہمی رہی۔ میں نے اس شادی میں جہاں زیب کے بھائی کی حیثیت سے حصہ لیا۔ شادی کے بعد صبا اپنی شاندار کوٹھی سے اس متوسط گھرانے کی بہو بن کر آ گئی۔

تقریب کے ہنگاموں سے جب فرصت ملی تو میں صبا سے ملنے کے لئے جہاں زیب کے کمرے میں گیا۔ سجے سجائے پلنگ پر صبا دلہن بنی بیٹھی تھی۔ میں نے جب پہلی بار غور سے صبا کو دیکھا تو میری نگاہیں اس کے ملکوتی حسن پر جم کر رہ گئیں۔ آسائشوں کی گود میں پلنے والی بہت بڑے گھرانے کی مجسمۂ حسن و جمال لڑکی اس معمولی خاندان میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کی لمبی لمبی، سفید مخروطی انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں جگ مگ کر رہی تھیں۔ نازک کلائیوں میں سونے کی حسین چوڑیاں اور کنگن اپنی چمک سے آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ گلابی گلابی ہتھیلیوں میں بڑے ہی نفاست سے حنا کی لالی رچائی گئی تھی۔ چہرے پر جھولتی ہوئی سہرے کی روپہلی لڑیوں کے اندر سے اس کا چاند سا چہرہ جھانک رہا تھا۔

جہاں زیب کے اشارے پر مرمریں ہاتھوں میں سلام کے لئے ایک ہلکی سی جنبش ہوئی جس سے چوڑیاں اور کنگن ایک مدھم سی ترنم خیز آواز سے کھنک اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی پلکوں کی سیاہ اور گھنی جھالریں بڑی ہی آہستگی سے اوپر اٹھیں اور دو کالی بڑی بڑی آنکھیں جن میں شہابی رنگ کی وجہ سے ایک خمار سا پیدا ہوگیا تھا۔ ایک لمحے سے میری نگاہوں سے ٹکرائیں اور پھر آہستہ

سے پلکوں کی باریک چلمن گر گئی۔ میں دل ہی دل میں جہاں زیب کی خوش قسمتی پر رشک کرنے لگا اور اس کی آئندہ زندگی کی خوشی کے لئے دعا کرتا ہوا وہاں سے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس کے بعد بھی میں حسب معمول وہاں جاتا رہا۔ بظاہر کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ پھر بھی جہاں زیب کی شادی کے بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے اب اس میں کوئی کمی آ گئی ہے۔ کچھ کھو سا گیا ہے۔ گھر کے تمام افراد ہر وقت صبا کے گرد جمع رہتے ہیں اور وہ ان کے درمیان کوہ قاف کی شہزادی معلوم ہوتی۔

صبا انار کی وہ نوخیز کلی تھی جو براہِ راست سبھی کے دلوں کے رباب کے تاروں پر مقراب بن کر لگی تھی۔ ایک سرور انگیز دھن تھی جو سب کے بدن میں بجلی کی لہر سی بن کر دوڑ گئی تھی۔ اس کی سحر انگیز شخصیت نے اس خاندان کے تمام دلوں کو آن واحد میں جھپٹ لیا تھا، تسخیر کر لیا تھا۔

جہاں زیب جسے سبھی مرے بھائی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ وہ اب صبا کا تھا، صرف [illegible] اس صبا کا جس کے انگ انگ سے اس کے لئے محبت کا خمار اٹھتا تھا۔ صبا کی بھیگی ہوئی نوخیز [illegible] کے عضو عضو کو مضطرب کر دیا تھا۔ ایسے میں بھلا وہ مجھے کس طرح پہچان پاتا۔

چنانچہ ہمارے درمیان اجنبیت کی ان دیکھی دیوار اٹھنے لگی۔ اس لئے جہاں زیب کی ذات میں نہ اب وہ اپنائیت رہی تھی نہ اس کے والد کی باتوں میں شفقت و محبت کا لگاؤ نہ اس کی والدہ میں ممتا کے جذبے کی بھرپور شیرینی اور سب سے بڑھ کر ثانیہ کی نگاہوں میں اس کی چاہت کا نشان تک نہ تھا۔ جو جذبات کی دنیا میں اتھل پتھل مچا دیا کرتے ہیں۔ میرا دل ایک نامعلوم گھٹن کا اسیر ہو چکا تھا جسے لے کر میں کمرے کی تنہائیوں میں اپنے ان گم شدہ جذبوں کو تلاش کرتا رہتا جو میری زندگی کا حسین سرمایہ تھے۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ قدرت کی وہ مہربانی جو جہاں زیب کے گھر پر ہوئی تھی اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر تہی دست ہو گیا۔ دولت کی دیوی جس کے اندر بہت بڑی کشش ہوتی ہے۔ اس نے پلک جھپکتے ہی سب کچھ اپنی

طرف کھینچ لیا اور میری زندگی کے وہ انمول لمحے جو میں اپنے دکھی وجود کے اندر سمیٹ لینا چاہتا تھا، جذب کر لینا چاہتا تھا وہ دولت و امارت کی خلیج میں کہیں روپوش ہو گئے، وہ حسین لمحات جنہیں میں نے کسی سے مانگ کر اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا وہ میری مٹھی کھلنے کے پہلے کہیں ہوا ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے رحمٰن صاحب کے معمولی مکان نے ایک شاندار کوٹھی کی جگہ لے لی۔ یہ کوٹھی صبا کی تھی اور اس کے اندر اس کی ہی حکمرانی تھی۔ اس حکمرانی نے بہت ہی جلد مشرقیت کے ایک گہوارے کو مغربیت کے تیز رنگوں میں رنگ دیا۔

اب اس گھر سے نماز صبح کے بعد تلاوت قرآن پاک کی سحر آفریں آوازوں کی بجائے ویڈیو اور وی۔سی۔آر کی آوازیں آتی ہیں۔ پروردگار کے حضور میں مناجات پڑھنے کے بدلے نغمہ و سرور کی محفلیں جمع ہوتی ہیں۔ بزرگان دین کے پاکیزہ تذکرہ کے بجائے فلمی ہیرو اور ہیروئنوں کے تذکرے ہوتے ہیں اور اسلامی پردوں کی محافظ وہ شرم و حیا کی پیکر خوبرو لڑکیاں اپنے لمبے بال شانوں تک کٹوائے لمبے لمبے ناخونوں پر نیل پالش کی تہہ چڑھائے صبا کے ساتھ کاروں میں بیوٹی پارلر اور سنیما گھروں کے چکر کاٹتی ہوئی نظر آتی ہیں اور میں دولت کی ریل پیل کے اس تیز و تند دھارے میں ایک بے حقیقت تنکے کی طرح بہہ گیا ہوں۔

☆☆☆

سرخ چوڑیاں

دور موجودہ میں اب مسلم معاشرے میں بھی ان گھرانوں کی اکثریت نظر آ رہی ہے جو اپنا معیار زندگی بلند رکھنے کے لئے جہیز جیسی لعنت کا سہارا لے رہے ہیں۔اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ دولت مند گھرانوں کی لڑکیوں کو بیوی اور بہو بنانا چاہتے ہیں۔اس کی وجہ سے صورت حال یہ پیدا ہوگئی ہے کہ آج مسلمان اسلام کا نام لیوا ہونے کا دعویٰ کرر ہے ہیں، مگر انہیں سنت رسول کی تقلید کرنا کسی طرح گوارا نہیں۔خود غرضی اور خود نمائی کی اس شرمناک بھیڑ میں غریب اور لاچار والدین اپنی جوان کنواری بیٹیوں کی آنکھوں میں رینگنے والے حسین سپنوں کی پرچھائیوں کو صرف دیکھتے ہیں اور بے بس ہیں کیونکہ کاتب تقدیر نے انسان کو اپنا مقدر اپنے ہاتھوں بنانے پر قادر نہیں کیا ہے۔اگر وہ اس پر اسے قادر کردیتا تو دنیا میں ایک بھی انسان مفلوک الحال نظر نہ آتا۔مفلوک الحالی کی اس سیاہ چادر نے نہ جانے کتنی حسرتوں کو اپنے سیاہ دامن سے ڈھانپ رکھا ہے۔اسے ہی ایک نادار اور مفلس والدین کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی نمی دست قدرت سے تراشا ہوا ایک حسین شاہکار تھی۔ایسا لگتا تھا کہ اس کی تخلیق شہد کی حلاوت اور گلاب کی رنگت سے کی گئی ہے۔وہ

شاعر کے تخیل اور مصور کے حسین خواب سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اس پر ماں کی بہترین تعلیم و تربیت اور صوم و صلوٰۃ کی پابندی نے اس کی شخصیت کو ایک انوکھا نکھار دے دیا تھا۔ اس کی تمام خوبیاں مل کر بھی اس کی پر شباب راہوں پر بکھرے ہوئے ان کانٹوں کو دور نہ کر سکیں جنہوں نے اس کی جوانی کو خاردار بنا دیا تھا۔ یہ کانٹے تھے اس کے مفلس باپ کی مفلسی کے!

نمی کے جوان ہونے پر خوش قسمتی سے ایک دن ان کے دروازے پر شہنائیوں کی سریلی آوازیں گونج اٹھیں۔ اس دن ان کا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا اور نمی خود سہاگ کے جوڑے میں ملبوس کوئی آسمانی حور لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کسی مومی مجسمے میں گلابی رنگ کی آمیزش کر دی گئی ہو۔ اس کی سہیلیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ مگر وہ ان سب سے بے نیاز یہاں تک کہ خود اپنے وجود سے بھی بے خبر صرف اپنے ہونے والے شریک سفر کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔ رات اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اس کا فسوں دھیرے دھیرے جاگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نمی کا پورا وجود گرماتا جا رہا تھا اور اس کے جسم پر معطر سی مدہوشی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ دھیمی دھیمی بہتی ہوئی ہوا میں اسے ایک عجیب سی نغمگی اور گنگناہٹ کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ اس کی جھکی جھکی حیابار نظریں اپنے حنائی ہاتھوں میں پڑی ہوئی سرخ چوڑیوں پر ٹکی تھیں اور خیالات کے کینوس پر ایک حسین سی دنیا آباد ہوتی جا رہی تھی۔ نئی زندگی، نئی راہیں، حسین اور سہانے سفر کے خیال نے اس کے انگ انگ کو ایک سرور افزا لذت سے آشنا کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے پورے وجود میں ایک روحانی مٹھاس گھلی جا رہی تھی۔ خوشیوں اور سرشاریوں سے بھرپور انہیں لمحوں میں اچانک ہی دولہا کے والد نے انتہائی رازدارانہ انداز میں نمی کے والد سے کہا ''بھائی صاحب مجھے آپ سے چند ضروری باتیں عرض کرنی ہیں۔'' نمی کے والد نے جواب دیا ''کیوں نہیں۔ بہ سر و چشم شوق سے ارشاد فرمائیں۔'' اور وہ سراپا ہمہ

تن گوش ہو گئے تب بڑے اطمینان سے دولہا کے والد نے ان سے کہا ''بھائی صاحب عرض صرف اتنی ہے کہ آپ نے اپنی بیٹی کو پروان چڑھایا، اسے ہر طرح کی تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا، یعنی آپ نے اپنے فرض کو بخوبی انجام دیا۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کی اس بے مثال تعلیم وتربیت کی وجہ سے وہ دن آ گیا ہے کہ ہم اسے اپنی بہو بنانے والے ہیں۔ مگر بھائی صاحب ان تمام باتوں کے ساتھ ہمارا ایک ارمان بھی ہے۔ وہ یہ کہ ہماری یہ بہو بھی ہمارے گھر میں اسی شان وشوکت اور جاہ وحشم کے ساتھ داخل ہو جیسی کہ اب تک ہمارے خاندان کی روایت رہی ہے۔ لہٰذا ہماری آپ سے صرف اتنی ہی گزارش ہے کہ آپ اس کے جہیز میں کم از کم دس ہزار کا سامان ضرور دیں۔'' نوشہ کے والد نے بڑی ہی آسانی سے یہ تمام باتیں کہہ ڈالیں اور یہ محسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ ان کے یہ الفاظ نمی کے والد کے کانوں کے راستے اتر کر ان کے کلیجے کے پار ہو گئے ہیں اور انہیں اپنے چھوٹے سے خستہ حال مگر عزت مآب گھر کی بنیاد ڈولتی نظر آ رہی ہے۔

اس دل شکن گفتگو کے بعد نمی کے والد کو یہ دیکھنے کا ہوش بھی نہ رہا کہ کس طرح شہنائیوں کی سریلی آوازیں دلفگار چیخوں میں تبدیل ہو گئیں اور کس طرح ان کے گھر میں خوشیوں بھری آنے والی بارات ان کی سلیقہ شعار خوبصورت بیٹی کے جسم سے سہاگ کا جوڑا نوچ کر واپس لوٹ گئی۔ نمی کسی بے جان بت کی طرح گردن جھکائے اپنی ان سوگوار گہری کالی آنکھوں سے جن میں یاسیت کے نامعلوم سائے لہرا رہے تھے گھر سے رخصت ہونے والے مہمانوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گھر مہمانوں سے خالی ہو گیا اور جس گھر میں کچھ دیر قبل شہنائیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں وہاں کسی شہر خموشاں کا سکوت طاری ہو گیا تھا۔ ایسے سکوت افزا ماحول میں نمی کو اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور اس کا ذہن صرف ایک بات سوچ رہا تھا۔ زندگی کی راہیں کتنی ٹیڑھی میڑھی اور طویل ہوتی ہیں۔ ان راہوں کو

تمام عمر طے کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ کیا میرے دل میں اتنی طاقت ہے کہ میں اس دشوار گزار راستے کو آسانی کے ساتھ طے کروں گی؟ پھر اس کی نگاہوں کے سامنے اس ان دیکھے انسان کا سراپا گردش کرنے لگا جو چند ساعت کے لئے ہی سہی مگر اس کے دل کو انجانی لذت سے سرشار کر گیا تھا۔ اس کے پورے وجود کو ایک انوکھی کیفیت سے آگاہ کر گیا تھا۔ اس کے اچھوتے وجود کا لمس اس کے ذہن پر بار بار دستک دے رہا تھا کہ میرا اس کا کیا تعلق تھا۔ میں اس رشتے اور لگاؤ کو کیا نام دوں؟ اس انسان کے لئے جس کی میں نے ایک جھلک تک نہ دیکھی ہے، اس کے لئے میرے دل کے اندر نامعلوم سی کسک کیوں ہے میں اس کے لئے بے چین کیوں ہوں جو مجھ سے ملے بغیر ہی ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا ہے۔

نمی نہ جانے کب تک اپنے لامتناہی خیالات کے دھارے میں بہتی رہی۔ رفتہ رفتہ جب کائنات کی ہر شے دھندلا گئی تو وہ کسی کٹی پتنگ کی طرح بستر پر گر گئی مگر بستر پر پڑی نرم و نازک پھولوں کی کلیاں کانٹوں کی مانند اس کے جسم میں چبھنے لگیں۔ وہ بے چین ہو ہو کر بار بار کروٹیں بدلنے لگی اور نہ جانے کب تک کروٹیں بدلتی خیالات کی دنیا کی لو میں جھلستی رہی۔ اس کربناک ماحول میں جب اس کا اضطراب حد سے بڑھ گیا تو وہ گھبرا کر پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا پورا وجود کسی انگارے کی طرح دہک اٹھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا جلتا ہوا سر تھام لیا۔ دفعتاً اس کی بے چین اور پریشان نگاہیں اپنی کلائیوں میں پڑی ہوئی ان سرخ اور جگمگاتی ہوئی چوڑیوں پر جم کر رہ گئیں جو اس کے سہاگ کی ضامن ہوتی۔ اور پھر افسردہ خیالات کے ریلے میں جھلستی ہوئی مجبور نمی نے ٹھکرائی کنواری لڑکی اور شکست خوردہ بے بس جوانی نے سماج کے زہریلے تیر و نشتر سے محفوظ رہنے کے لئے ان ہی سہاگ کی چوڑیوں کا سہارا لے لیا۔ اس نے ان چوڑیوں کو پیس کر پانی میں ملایا اور گھونٹ گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔

نمی کے والد کی طویل بے ہوشی اس وقت ٹوٹی جب لوگ نمی کا جنازہ قبرستان لے جانے

کی تیاری کر رہے تھے۔ نمی کو اس کے تمام ادھورے سپنوں اور تشنہ تمناؤں کے ساتھ منوں مٹی کے اندر دفن کر دیا گیا۔ جب لوگ اس کی لاش کو سپرد خاک کر کے لوٹ رہے ہوں گے تو شاید ان کے ذہن کہہ رہے ہوں گے کہ ایک غریب باپ کے ناتواں کاندھوں سے جوان بیٹی کی شادی کی فکر کا بوجھ اتر گیا۔ مگر جب مڑ کر نمی کی قبر کی طرف ایک حسرت بھری نظر ڈالی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے اس کی قبر سے اڑتی ہوئی خاک کے ہر ذرے سے ایک نئی نمی کی تصویر ابھر رہی ہے۔

میں لرز اٹھا۔ کیا ان سب کا انجام بھی وہی ہوگا اور سہاگ کی سرخ چوڑیاں اس کام آتی رہیں گی؟ سرخ چوڑی، سرخ چوڑی، ایک بازگشت، ایک سوال؟

☆☆☆

میں نے تھاما ہے دامن تمہارا

ڈاکٹر شمشاد علی کو اللہ نے صرف ایک ہی بیٹی دی تھی۔ نوری۔ جس کے پیدا ہونے کے صرف چند ہی مہینے کے بعد ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ انہوں نے بیٹی کے خیال سے دوسری شادی نہیں کی اور اسے ماں باپ دونوں بن کر پروان چڑھایا۔

نوری کے چہرے پر ظاہری حسن و خوبصورتی کی چمک دمک نہ تھی۔ مگر باپ نے اس کی تعلیم و تربیت کچھ اس ڈھنگ سے کی تھی کہ وہ حسن سیرت کا ایک بے مثال شاہکار بن گئی۔ چونکہ باپ نے اپنی ساری زندگی اسے ہنر و شائستگی کے زیور سے سنوارنے میں صرف کر دی تھی۔ اس لئے نوری کو اس کا یہ صلہ ملا کہ اس کے ہاتھوں کی دس انگلیاں ہنر و سلیقے کا ایسا چراغ بن گئیں جن کی روشنی سے شمشاد علی کا گھر جگمگا اٹھا۔ نوری کی تعلیم و تربیت اس بہتر ڈھنگ سے کرنے کے بعد وہ بالکل مطمئن ہو گئے تھے۔ اس کی جملہ خوبیوں کی وجہ سے انہیں یقین تھا کہ شادی کے بعد اپنی معمولی شکل و شباہت کے باوجود وہ اپنے مجازی خدا اور سسرال والوں کا دل جیت لے گی۔ انہیں اس کی فہم و فراست پر پورا بھروسہ تھا۔

نوری کے لئے جب ڈپٹی احمد سعید کے چھوٹے بھائی حارث سعید کا رشتہ آیا تو انہوں نے اسے فوراً ہی منظور کرلیا۔ یہ رشتہ ہر طرح مناسب اور موزوں تھا۔ ڈپٹی احمد سعید ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا گھر صرف دو افراد یعنی دو بھائیوں پر مشتمل تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد احمد سعید نے حارث سعید کی تعلیم و تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی اور اسے انجینئرنگ تک کی تعلیم دلائی تھی۔ ان کے والدین نے اس دنیا میں اپنی نشانی کے طور پر یہی دو لڑکے چھوڑے تھے جن کے درمیان محبت اور پیار کا ایک اٹوٹ رشتہ قائم تھا۔

احمد سعید کی بیگم کو بھی اپنے دیور سے بے انتہا پیار تھا۔ گھر میں دو بھائیوں، بھابھی اور بچوں کے سوائے اور کوئی نہیں تھا۔ حارث سعید کی بھابھی کا خیال تھا کہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی نگہداشت اور پرورش میں مشغول رہنے کی وجہ سے وہ گھر کے نظم واہتمام سے کچھ بے گانہ سی ہوگئی ہے۔ انہیں گھر کے رکھ رکھاؤ میں کچھ بدنظمی اور بے ترتیبی نظر آنے لگی تھی اور سلیقے میں کمی کا احساس تو شدت سے ہو رہا تھا۔ ان کے یہاں اللہ کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ اگر کمی تھی تو صرف حسن انتظام کی۔ لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ ان کے دیور حارث کی بیوی ایسی ہو جو اپنی سلیقہ شعاری سے اس گھر کی بے ترتیبی کو دور کر سکے۔ چنانچہ اپنے دل میں اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے حارث کے لئے لڑکی کی تلاش شروع کردی۔

وہ اپنی تلاش میں سرگرداں تھی کہ کسی نے ان سے شمشاد علی کی لڑکی نوری کا تذکرہ کیا جو ان کے معیار کے مطابق تھی۔ انہوں نے ان کے گھر جا کر نوری کو ہر طرح سے جانچا پرکھا اور حارث کے لئے منتخب کرلیا مگر اسے قسمت کی ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ حارث کی سادہ دل بھابھی نے جس وقت نوری کی سلیقہ شعاری کی بنا پر اسے اپنے گھر کی بہو بنانے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت وہ اپنے دیور کے دلی جذبوں سے قطعی ناواقف تھیں۔ ان کے صاف ستھرے اور پاکیزہ خیالات کے برعکس حارث کی فطرت میں حسن پرستی کا بے پناہ جذبہ شامل تھا۔ وہ حسین سا چہرہ

دیکھ کر کہیں کھو جاتے تھے اور ان کے دل کی جھیل پر کسی نہ کسی ماہ کامل کا عکس ہمیشہ جھلملاتا رہتا تھا۔ مگر اپنی شرمیلی فطرت کی وجہ سے انہوں نے اس کا ذکر اپنی بھابھی سے کبھی نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اس دبے ہوئے احساس سے بے خبر ان کی بھابھی نے انہیں بڑے ہی شوق اور ارمان سے دولہا بنا ڈالا۔ ایک سہانی شام کو نوری دلہن بنائی گئی۔ اس کے گھر کے دروازے پر شہنائیوں کی سریلی دھن گونجی اور نکاح کے مقدس بول کے عوض وہ بابل کے گھر سے رخصت ہو کر حارث کے کمرے میں آ گئی۔

حارث کے گھر میں ہر طرف نور کا ایک سیلاب سا امڈا ہوا تھا۔ اور ہلچل کی سی فضا میں ملی جلی ہنسی اور گیت کی آوازیں ان کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں اور ان کا ذہن بار بار ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ اندھیری رات میں لوگوں کو راستہ بتانے والا چاند دلہن بن کر ان کے کمرے میں چلا آیا ہوگا۔ وہ اس بات سے اب تک بالکل بے خبر تھے کہ ان کے اس خیال کے برعکس ان کی شریک حیات نوری بہت ہی معمولی نقش و نگار کی لڑکی ہے۔ ان کی بھابھی نے رات گئے جب انہیں ان کے کمرے کے دروازے پر لا کھڑا کیا تو کمرے کے اندر داخل ہونے سے قبل انہوں نے اپنے مردانہ حسن و جمال والے سراپے پر ایک نظر ڈالی اور معنی خیز انداز سے مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ حجلہ عروسی کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر فضا اچانک ہی ان کے دل و دماغ پر ایک سحر بن کر چھا گئی۔ انہوں نے جذبات کی شعلہ بار امنگوں کے ساتھ نوری کا سرخ گھونگھٹ اٹھا دیا۔ مگر گھونگھٹ اٹھاتے ہی ان کے دل کے اندر بسا ہوا خوبصورت خیالوں کا محل کرچی کرچی ہو کر ان کی نگاہوں کے سامنے بکھر گیا۔

نوری کی معمولی شکل و صورت ان کے جذبات کی دنیا پر ایک بجلی بن کر گری اور لمحہ بھر میں ہی اسے خاکستر کر گئی۔ انہوں نے اپنے وجود کے رگ رگ میں ناگواری کی تیز لہر کو اٹھتے ہوئے محسوس کیا اور پھر آہستہ سے گھونگھٹ چھوڑ دیا۔ گھونگھٹ چھوڑنے کے بعد وہ کچھ دیر تک

بالکل ساکت سے وہیں پر بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر بے حد تھکے تھکے قدموں سے یہ سوچتے ہوئے باہر نکل گئے کہ آخر بھابھی نے مجھ سے یہ کون سے جنم کی دشمنی نکالی ہے کہ دنیا بھر کی بدصورتی کو سمیٹ کر میرا مقدر بنا دیا۔

رات آہستہ آہستہ سرکتی رہی اور حارث اس اہم رات کی تمام رنگینیوں سے بے خبر اور بے نیاز باہر کے کمرے میں سوتے رہے۔ اتنا ہی نہیں کئی ہفتے گزر گئے مگر حارث نے کبھی اس کمرے میں قدم نہیں رکھا۔

نوری کے ابا کے تمام خیالات اس وقت بالکل غلط ثابت ہوئے جب ان کی ہنر مند اور سلیقہ شعار تعلیم یافتہ بیٹی کو اس کے مجازی خدا نے خوبصورت نہ دیکھ کر اسے سہاگ رات میں ہی ٹھکرا دیا۔ حارث کی بھابھی نے انہیں اپنی تمام دلیلوں سے بے حد سمجھانے کی کوشش کی مگر ان کی کسی بھی دلیل کا حارث پر کوئی اثر نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ یہ چہ مگوئیاں جب نوری کے والد کے کانوں میں پڑیں تو ان کے دل کو شدید جھٹکا لگا اور اس خیال سے ان کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں کہ کہیں بابل کے گھر سے وداع ہونے والی بیٹی دوبارہ پھر ان کی چوکھٹ پر واپس نہ آئے۔ ایک دن ان کا خدشہ سچ ثابت ہو ہی گیا جب نوری طلاق کا پروانہ لے کر ان کے سینے سے آ لگی۔ اس کے ٹوٹے ہوئے وجود سے اس کے جلے ہوئے وقار کی راکھ اڑ رہی تھی اور وہ باپ سے سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

''ابا لڑکیوں کے پاس جب حسن کی دولت نہیں ہوتی تو ان کی تعلیم اور ہنر مندی کو نفرت و حقارت کے بے رحم قدموں تلے روند ڈالا جاتا ہے۔ آج یہی المیہ آپ کی بیٹی کے ساتھ ہوا ہے۔

جوان بیٹی کا شادی کے فوراً بعد ہی اجڑ کر میکے واپس آ جانا کوئی معمولی سانحہ تو نہیں ہوتا۔ نوری کے ابا اپنی زندگی بھر کی کاوش کا یہ انجام برداشت نہ کر سکے اور اس غم کو سینے کے اندر

دبائے مالک حقیقی سے جا ملے۔

باپ کی موت کے بعد نوری کے سامنے صرف اس کا ٹوٹا بکھرا وجود اور زندگی کی پر خار راہیں رہ گئیں۔ ان راہوں پر بھٹکتے ہوئے ایک دن اس کی ملاقات پرنسپل ہاشم سے ہوئی۔ وہ ایک ہمدرد انسان تھے۔ انہوں نے نوری کی زبانی اس کی درد بھری کہانی سنی۔ نوری نے اردو میں ایم اے کیا تھا اس لئے انہوں نے اپنی کاوش سے اسے ایک کالج میں اردو ٹیچر کی جگہ دلوادی۔ اس کالج میں اس کا تقرر ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ وہاں اس کی ملاقات شہاب سے ہوئی۔ شہاب سوشیولوجی کا لکچرر تھا۔ اس کی شخصیت میں مردانہ حسن و وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چند ملاقاتوں کے بعد ایک دن شہاب نے نوری سے باتوں کے دوران ہی ایک سیدھا سا سوال کرڈالا۔ معاف کیجئے گا نوری صاحبہ کیا آپ اپنی زندگی کا یہ طویل سفر بالکل تنہا طے کرسکتی ہیں۔

نوری نے بہت ہی افسردہ مگر تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''شہاب صاحب اپنے لئے تنہائی کا یہ سفر میں نے خود منتخب نہیں کیا ہے بلکہ مجھے اس کے لئے مجبور کیا گیا ہے۔ میری زندگی اس المیے سے صرف اس لئے جوڑی گئی ہے کہ میں خوبصورت اور پر کشش نہیں ہوں اور میں یہ نہیں جانتی کہ اپنی اس بے وقعتی کا الزام کسے دوں، پھر بھی میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو لوگوں کے سامنے رو پیٹ کر خود کو ہمدردی کا مستحق سمجھتی ہیں۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ رنج و غم کی نمائش سے کرب و اذیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ دکھ جب انسان پر پڑ جاتا ہے تو اسے اکیلے ہی جھیلنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے دکھ درد کو خود اپنے ہی تک محدود رکھا ہے۔ طلاق کا بوجھ ایک عورت کی تذلیل کی بدترین شکل ہے جو میری ذات کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ اتنا کہہ کر نوری دور کہیں خلاؤں میں دیکھنے لگی۔

نوری کے خاموش ہوتے ہی شہاب نے کہا ''مگر نوری صاحبہ آپ اس حقیقت سے بھی تو واقف ہوں گی کہ دنیا میں ہر انسان کے خیالات اور احساسات بالکل ایک جیسے نہیں

ہوتے۔اب مجھے لیجئے۔ میری نظروں میں خوبصورتی یا بدصورتی کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ میں تو ایک انسان کے کردار کی پختگی کو ہی سب سے زیادہ سمجھتا ہوں۔اس کے ساتھ ہی انسانی ہمدردی کو شرافت کا درجہ دیتا ہوں کیونکہ ایک انسان کا دوسرے انسان کا ہمدرد اور مددگار ہونا زندگی کا حاصل حیات ہے۔

نوری حالات کی ٹھکرائی اور زمانے کی ستائی ہوئی ایک کمزور سی لڑکی تھی۔شہاب کی باتوں نے اس وقت اس کے دل پر نہ جانے کون سا اثر کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے پگھل کر رہ گئی اور شہاب نے دیکھا کہ اس کے سانولے چہرے پر سوچ وتفکر کے سائے لرزاں ہیں۔ کچھ دیر کے سکوت کے بعد اس نے کہا ''ہوسکتا ہے شہاب صاحب کہ آپ کا خیال بھی ایک حد تک درست ہے۔مگر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ آج کے معاشرے میں مجھ جیسی بدصورت اور طلاق یافتہ لڑکی کا ہم سفر بننا کوئی پسند نہیں کرے گا۔'' نوری کی زبان سے اتنا سنتے ہی شہاب نے فوراً کہا۔

''نوری صاحبہ اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں اس مقصد کے لئے اپنا نام پیش کرسکتا ہوں۔نوری اچانک ہی اس غیر متوقع پیش کش پر بوکھلا گئی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے شہاب کے پرکشش مردانہ حسن کو دیکھتی رہ گئی۔اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ شہاب جیسا خوبرو کنوارا مرد اس کے سامنے یہ تجویز رکھ رہا ہے۔وہ بڑی مشکل سے اس سے صرف اتنا ہی کہہ سکی کہ ''شہاب صاحب آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔کیا آپ کے والدین آپ کو اس کی اجازت دیں گے۔''

شہاب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''قسمت نے مجھے بچپن ہی میں والدین کے سائے سے محروم کردیا تھا۔تب سے محرومی اور تنہائی کی لاش کو سینے سے لگائے دربدر بھٹک رہا ہوں۔''

شہاب سے اس گفتگو کے بعد رات کی تنہائی میں نوری اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی ہوئی

سوچ رہی تھی۔ میں اپنے ماضی کے ان واقعات کو جو غموں سے پر ہیں، فراموش کر دینا چاہتی تھی لیکن کیا حقیقت میں قید حیات کا یہ لمبا سفر مجھ سے تنہا کٹ سکے گا۔ شاید نہیں۔ تو پھر کیوں نہ میں فرشتہ صفت شہاب کو اپنی زندگی کا شریک سفر بنالوں۔ ہوسکتا ہے جذبات کی گرمی میں ابھی تھوڑی سی زندگی کی رمق باقی ہو اور پھر صبح کی آمد سے قبل ہی نوری نے اپنی زندگی کی ڈگر کو بدلنے کا فیصلہ کرلیا۔

نکاح کے مقدس بول ایک بار اور دوہرائے گئے اور وہ خاموشی کے ساتھ شہاب کی زندگی میں داخل ہوگئی۔

وقت گزرنے لگا۔ کئی ماہ بیت گئے اور اس درمیان نوری کو ایک بار بھی یہ احساس نہ ہوسکا کہ شادی کے پہلے ماہ سے ہی شہاب اس کی پوری تنخواہ کا مالک بن گیا ہے۔ اس کا خیال تو صرف شہاب کی شریک حیات بن کر اسی خیال سے سرشار تھا۔ وہ صرف اتنا سوچ کر ہر طرح مطمئن تھی کہ جب وہ اپنا مکمل وجود شہاب کو سونپ چکی ہے تو پھر ان بے جان سکوں کی کیا اہمیت ہے۔ مگر حقیقت تو بہرحال حقیقت ہوتی ہے۔ وہ محض خوش رنگ احساسات کے سہارے تبدیل نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ وقت کی اڑان کے ساتھ رفتہ رفتہ نوری کو یہ احساس ہونے ہی لگا کہ وہ پیسے پیسے کی محتاج ہوتی جارہی ہے اور اس سے بھی زیادہ وہ اس اذیت ناک خیال سے پریشان تھی کہ شہاب میں پہلے جیسا والہانہ پن نہیں رہ گیا ہے۔ وہ کئی کئی رات گھر نہ لوٹتا اور نوری کی زخمی روح اس کے انتظار میں پھڑپھڑاتی رہتی۔ ایک دن پاس پڑوس کی عورتوں سے نوری پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ شہاب تو ایک عرصہ سے اپنے ہی محلے کی ایک خوبصورت لڑکی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے، جس کا نام سحر ہے۔ شہاب اس کے حسن کا دیوانہ ہو کر اس سے شادی کرنے والا تھا۔ مگر سحر کے والدین کی یہ شرط تھی کہ شہاب بارات خوب دھوم دھام سے لے کر آئے جو اس کی محدود تنخواہ سے ممکن نہیں تھا۔ اس لئے اس نے نوری جیسی لڑکی کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر اسے

اپنے بندھن میں قید کرلیا تھا اور سحر کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ شادی کے بعد نوری کی حیثیت اس گھر میں محض ایک دودھ دینے والی گائے اور ملازمہ کی ہوگی۔

اس سنگین صداقت کے سامنے آتے ہی نوری کے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچی۔ وہ اس خیال سے بری طرح کھول اٹھی کہ شہاب کے متعلق تو وہ ایسا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ تو اس کی نگاہوں میں ایک ایسے بلند کردار کا انسان تھا جو کسی مصیبت زدہ کی ہمدردی میں طوفانوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس لئے اس نے شہاب کو اپنے دل کے سنگھاسن پر سب سے اونچا مقام دیا تھا۔ اس کے وجود کے روئیں روئیں نے اس کی عظمت اور انسانیت کا گیت گایا تھا۔ اس کے غموں سے چکنا چور دل نے اس کا سہارا پا کر ایک پرسکون گرہستی کا خواب دیکھا تھا اور اب عظمت اور کردار کی پاکیزگی کا وہ عظیم الشان تخت جس پر اس نے شہاب کو جگہ دی تھی وہ اس مکروہ حقیقت کی سخت چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ پھر بھی اس نے بہت ہی صبر وضبط سے کام لیا اور شہاب سے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ مگر شہاب کی لاپروائیاں اس کے ساتھ بڑھتی ہی گئیں اور نوری کی زندگی روکھے پھیکے شب و روز میں قید ہو کر رہ گئی۔ ایک کمرے کا چھوٹا سا سناٹوں سے بھرا گھر تھا۔ تنہائیاں اور اداسیاں اس کی ساتھی تھیں اور وہ اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو تھامنے کی کوشش کر کے خدا سے ایک ہی سوال کرتی رہتی۔

"پروردگار میرا قصور کیا ہے؟"

بالآخر ایک دن نوری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے ٹھان لیا کہ اب وہ اپنی محنت کی کمائی کا ایک پیسہ بھی شہاب کی نذر نہیں ہونے دے گی اور پھر اس بات کو لے کر ایک دن اس کی شہاب سے زبردست لڑائی ہوئی۔ اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے شہاب سے کہا۔

"تم نے مجھے دن رات جلایا تڑپایا رلایا، مگر میں نے تمہارے سامنے زبان تک نہ کھولی۔ اب مجھ میں مزید ظلم سہنے کی طاقت نہیں ہے۔"

شہاب بجائے شرمندہ ہونے کے آنکھیں نکال کراس سے کہنے لگا۔

''سنو نوری اگر آئندہ سے تم نے کہی سنی باتوں پر یقین کر کے مجھ سے لغو باتیں کیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ نوری پھٹ پڑی۔ اس کے ہاتھ سے صبر کا پیمانہ چھوٹ چکا تھا۔ اس نے تیز آواز سے کہا۔

''تو اب تمہارا اور میرا نباہ نہیں ہوسکتا۔ شہاب بری طرح دہاڑا۔ تو ٹھیک ہے چلی جاؤ یہاں سے۔ آج کے بعد تمہارا اور میرا کوئی تعلق نہیں۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ مجھے تم جیسی بدصورت اور بد دماغ عورت کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری آزادی کا پروانہ ابھی لکھ دیتا ہوں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ٹھوکر سے دروازہ کھول کر نکل گیا۔ نوری ایک بے جان بت کی طرح دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کی دنیا کے اندر ایک طوفان اٹھ رہا تھا اور اسے یاد آرہا تھا کہ شہاب نے اس سے ایک بار کہا تھا کہ ''نوری تم میری چاہت کا سمندر ہو اور اب نوری کو اس سمندر کی خاصیت معلوم ہوگئی تھی کہ وہ کس طرح ایک جاندار شیشے کو نگل کر مردے کی شکل میں واپس پھینک دیتا ہے۔

دوسری بار طلاق کا پروانہ پا کر نوری بالکل ٹوٹ گئی۔ اس کی اگلی پچھلی تمام تلخیوں نے اس کے ٹوٹے پھوٹے وجود کو اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ دن گزرنے کے بعد اس کی تمام شب سولی پر لٹکے ہوئے گزرتی۔ وہ سوچتی رہتی کہ میری زندگی کا فائدہ کیا ہے؟ کرب و اذیت کے ساتھ وقت گزرنے لگا۔ زندگی کسی مشین کی طرح چل رہی تھی۔ بہت ہی الجھی الجھی سی جس کی نہ کوئی منزل تھی نہ کوئی جانا پہچانا راستہ۔ خوش آیند مستقبل کا کوئی خواب نہ گزرے ہوئے ماضی کی کوئی حسین سی یاد بے کیف سے دن اور کراہتی ہوئی راتیں تھیں جس کے درمیان گھر کے وہ ہر وقت یہی چاہتی کہ وہ یہاں سے کہیں دور چلی جائے، دور بہت دور اپنی تمام پرانی یادوں سے دور۔ مگر کہاں اس سوال کا بھی اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ تو بس جی رہی تھی ایک ایسی زندگی جس

میں خزاؤں نے ہمیشہ کے لئے اپنا گھر بنالیا تھا۔ دنیا کی تمام خوشیاں اس کے لئے بے معنی ہو چکی تھیں۔ اسے محسوس ہوتا کہ دنیا کی بے حس سڑک پر وہ ایک پتھر کی طرح پڑی ہے۔

انسان جب انسانوں سے مایوس ہو جاتا ہے تو تھک ہار کر خدا کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ چنانچہ نوری کا دم جب اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی گھور تاریکی سے گھٹنے لگا تو اس اندھیرے کے درمیان اسے ایک ایسی روشنی کی تلاش ہوئی جو اسکی زندگی کی راہوں میں پھیلی ہوئی تاریکی کو دور کردے۔ اس کے لئے اس نے خالق کائنات سے لو لگا کر خود کو عبادت اور ریاضت کی دنیا میں گم کردیا۔ عبادت الٰہی کے اس سہارے نے اسے وہ گوہر آبدار عطا کیا جس کے نور کے آگے اسے دنیا کی ہر کشش انتہائی بے وقعت نظر آنے لگی اور اس نے محسوس کیا کہ اس نے اب جو دامن تھام لیا ہے اس نے اس کے تمام دکھوں کو خود میں سمیٹ لیا ہے۔

☆☆☆

فسانہ خون دل کا

موسم بہار کا وقت ہے۔ شام کا بھیگا بھیگا سہانا سماں ہے اور میں اس وقت اپنے مکان کی بالکونی سے لگی راحیل کے مکان کی طرف دیکھ رہی ہوں جس کے اندر زرینہ بیگم نے نماز ختم کی ہے اور کافی دیر تک وظائف میں مشغول رہی ہیں۔ اس کے بعد اپنی دونوں پوتیوں فرحین اور شاہین کو لے کر گھر سے منسلک باغیچہ کی طرف چلی گئیں جہاں انگور کی گھنی بیلوں کے سایے میں ٹائلوں والے فرش پر سفید پینٹ کی کرسیاں ترتیب وار رکھی گئی تھیں۔ ان کرسیوں پر رنگین مخملی کشنز بڑے ہی دلکش لگ رہے ہیں۔ اس خوبصورت نئے مکان کے سامنے احاطے کی دیوار کے ساتھ لگے اشوک کے درختوں کی شاخیں آہستہ آہستہ جھولتی رہتی ہیں اور گل مہر کے پیڑ لالہ زار پھولوں کے بطن سے بھینی بھینی خوشبوئیں پھوٹ پھوٹ کر ہواؤں کے دوش پر پھیلی رہتی ہیں۔ یہ باغیچہ خوش رنگ مہکتے پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ اس گھر کا یہ روزانہ کا معمول ہے کہ راحیل کے گھر آنے کے قبل اس کی دونوں بچیاں اپنے ہوم ورک سے فارغ ہو جاتی ہیں اور اس کے آتے ہی سب ایک جگہ بیٹھ کر ناشتہ کرتی ہیں۔ کبھی ٹی۔ وی کے سامنے اور کبھی اس خوشنما باغ میں۔ اس وقت بھی

راحیل آفس سے واپس آکر باغ کے اندر کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔ اس کی خوبصورت بیوی نازیہ وہاں پر چائے اور ناشتے کی ٹرے لے کر آگئی اور اپنی دلفریب مسکراہٹ سے شوہر کا استقبال کیا اور پھر ناشتے کے دوران باتوں اور خوش گپیوں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ چل نکلا کہ وقت کے گزرنے کا کسی کو احساس ہی نہیں ہوا۔ ان کی دلچسپ باتوں کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب گھر کی ملازمہ نے ڈائننگ روم میں کھانا سجا کر انہیں اس کی اطلاع دی۔

یہ اس گھر کا روزانہ کا معمول تھا۔ شام کے وقت نازیہ سفید پالش کی کرسیوں کو باغیچے کے اندر بنی ہوئی اس مختصر سی نشست گاہ میں ترتیب وار لا کر رکھ دیتی اور راحیل کے آنے کے بعد سب گئی رات تک باتوں میں مشغول رہتے۔ اس مخصوص جگہ پر جب یہ خوش رنگ محفل جمتی تو میں خود بخود ہی اپنے مکان کی بالکونی سے خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے ٹکٹکی باندھ کر لگاتار راحیل کی طرف دیکھتی رہتی جس کے مردانہ حسن و شباب پر دولت اور سکون زندگی کا نشہ بہار بن کر چھایا تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر ایک خاص قسم کی کشش پیدا ہوگئی تھی۔ وہ ہمیشہ سفید قمیض اور سیاہ پینٹ میں ملبوس رہتا اور کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں لگتا۔ اس گھر کے ٹھاٹ باٹ اور مسرور کن ماحول کو دیکھ کر میں سوچتی ہوں کہ کیا لوگ اسے زندگی کی تکمیل سمجھتے ہیں۔ دیکھنے والی نظریں اس گھر کے طرز زندگی کو ستائشی نظروں سے دیکھتی ہوں گی۔

مگر یہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں کہ یہ گھر کب ہے۔ یہ تو ایک قبرستان ہے۔ کسی کی آرزوؤں کا مدفن ہے۔ ایک ایسی بدنصیب لڑکی کی تشنہ تمناؤں کا مزار ہے جو اپنی نارسائی کا بوجھ نہ اٹھا سکی اور اس گھر کی خاک پر ڈھیر ہوگئی۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ گھر اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ انتہائی بدصورت اور خوفناک بھی ہے۔ یہ وہ بھیانک گھر ہے جو کبھی میری پیاری سہیلی سیمی کو اس کی معصومیت اور بھولے پن کے ساتھ نگل گیا ہے۔ کاش لوگ اس گھر کی خوش نصیبی کے پس پشت چھپی ہوئی کسی بے گناہ لڑکی کی ان دکھوں کی جھلکیاں بھی دیکھ سکتے ہیں جو بے ایمانی اور بے

وفائی کی قربان گاہ پر قربان کردی گئی۔ وہ معصوم سی لڑکی سر سے پاؤں تک ایک ایسا سمندر تھی جو اندر ہی اندر سفر کرتے کرتے خاموشی کے ساتھ خس وخاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے جس کے باہر نہ کبھی کوئی بوند برستی ہے نہ ہی کوئی طوفان اٹھتا ہے اور نہ کوئی آندھی چلتی ہے۔ تب ہی تو وہ بھولی بھالی نادان لڑکی بھرپور جوانی میں ہی سکون کی چادر اوڑھ کر سوگئی۔ اس خیال کے آتے ہی میں اپنی ان تمام دلی نفرتوں کے ساتھ جو اس گھر سے وابستہ ہیں، اس جگہ سے ہٹ جاتی ہوں اور اپنے کمرے کے اندر آ کر بستر پر ڈھیر ہو جاتی ہوں۔ پھر یسمی کی یادوں کا طوفان اٹھنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی میں اپنے اندرونی کرب واذیت کو دل میں دبائے بستر پر گر پڑی ہوں اور خالی خالی نظروں سے کمرے کے درودیوار کو تک رہی ہوں۔ ان دیواروں پر مجھے چند ساکت چہرے نظر آرہے ہیں۔ یسمی کا چہرہ اس کے ابو کا چہرہ اس کی ماں کا چہرہ اور اس کے بھائیوں کا چہرہ ان کی آنکھوں میں غم واندوہ اور بے بسی کے آنسو تیر رہے ہیں۔ کچھ دیر ساکت رہنے کے بعد یہ چہرے آپس میں گڈمڈ ہو کر دیواروں میں سما گئے ہیں اور کمرے کے اندر چاروں طرف تاریکیاں چھا گئی ہیں اور آسمان بجلی کی سی تڑپ کی لہریں بنا بنا کر میرے وجود کے اندر گزرے ہوئے ہر واقعے کو دوہرانے لگا ہے۔ اس وقت مجھے یسمی یاد آرہی ہے۔ اس کے منجمد لب یاد آرہے ہیں۔ اس کے کمزور وجود پر چھائی ہوئی دبیز خاموشیوں کی تہ در تہ وہ پرتیں یاد آرہی ہیں جو یسمی کو لے ڈوبیں۔ اندھیروں میں چھپا گئیں اور میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ صرف ہاتھ ملتی رہ گئی۔ اس وقت میرے دل کے اندر نفرت کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ اس کی خوفناک آوازوں سے پریشان ہو کر میں کمرے سے باہر نکل آئی ہوں اور چھت پر سے کھڑے ہو کر یسمی کے گھر کے صحن کو دیکھ رہی ہوں۔ صحن کو دیکھ کر یسمی کی یاد سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ آہ کیسی ویرانی برس رہی ہے اب اس گھر میں۔ اس گھر کے مکین اپنے سینے کے اندر ایک کبھی نہ ختم ہونے والا دکھ لے کر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ تب سے یہ گھر خالی اور ویران پڑا ہوا ہے۔ اس گھر

کو آباد کرنے کے لئے دوبارہ کوئی نہیں آیا۔

اب سے تقریباً دس سال قبل اس گھر کے صحن میں صبح صادق کی دھندلی کرنوں میں نہایا ہوا معصوم یسی کا جنازہ سفید کفن میں لپٹا ہوا آخری دیدار میت کے لئے رکھا گیا تھا۔ اور گھر کے تمام افراد اس دردناک منظر کے باوجود پولس کیس اور اپنی تشہیر کے ڈر سے دل کھول کر رو بھی نہیں سکتے تھے۔ صرف وقفے وقفے سے ایک گھٹن بھری دھیمی چیخ ابھرتی تھی اور اندر ہی اندر گھٹ کر دم توڑ دیتی تھی۔ میں جب بھی اس جگہ آکر کھڑی ہوتی ہوں وہ اندوہناک سماں نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے۔

رات کے تقریباً دس بج رہے ہیں۔ زرینہ بیگم کا مکان دودھیا چاندنی میں نہایا ہوا اس وقت اور بھی خوبصورت اور بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ قدرت نے زرینہ بیگم کی جھولی میں ایک ساتھ زندگی کی تمام خوشیاں ڈال دی ہیں اور وہ گزرنے والے وقت کے ایک ایک لمحے سے خوشیوں اور مسرتوں کے خزانے بٹور رہی ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ ایسا کرتے وقت کیا انہیں کبھی اس بات کا احساس ہوتا ہوگا کہ یہ بہاریں، یہ خوشیاں جو شاید ان کا مقدر نہ تھیں وہ انہیں کسی نیک دل ہستی کی قربانیوں کے صلے میں ملی ہیں۔ بظاہر عبادت گزار، متقی، پرہیزگار نظر آنے والی زرینہ بیگم کے اندر کس قدر گھناؤنی اور مکروہ شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ صرف میں جانتی ہوں کہ خود کو خوش گفتار اور مخلص ظاہر کرنے والی یہ عورت اندرونی طور پر کتنی بے رحم، خود غرض اور سفاک ہے جس نے اپنی خوشگوار، پرمسرت زندگی کے شیش محل کی تعمیر کے لئے ایک بھولی بھالی اور معصوم لڑکی کے خون کا انتخاب کیا تھا۔ اس بے گناہ لڑکی کے خون کی سرخی مجھے ہر وقت اس گھر کے در و دیوار پر نظر آتی ہے اور میرے دل کے اندر اس فسانے کو دوہراتی ہے جو اس بدنصیب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا۔ اپنی موجودہ کامیاب اور خوشیوں بھری زندگی کی دلفریب ساعتوں میں گم ہو کر زرینہ بیگم اس تلخ حقیقت کو فراموش کر چکی ہیں کہ یسی کی وہ دردناک موت جو خودکشی کی شکل میں

ہوئی تھی اس کی ذمہ دار وہی ہیں۔ اسے بربادی کے راستے پر دھکیلنے والی ایک انتہائی بے رحم عورت جن پر انجانے میں بھروسہ کر کے معصوم یمی ایک ایسے راستے پر جا کھڑی ہوئی تھی جہاں اس کے سامنے سوائے موت کو گلے لگانے کے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اس وقت زرینہ بیگم کے مکان کے اندر سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی موسیقی کی دھن فضا میں ایک مدہوشی کی سی کیفیت طاری کر رہی ہے اور میرا دل یمی کی یاد سے بہت بے چین ہوتا جا رہا ہے۔ نگاہوں کے سامنے گزشتہ دس سالوں کی تمام تصویریں ایک ایک کر کے گزر رہی ہیں۔ یمی میری بہت ہی پیاری اور گہری سہیلی تھی۔ ہم دونوں ہمیشہ سے ایک دوسرے کے راز دار رہے تھے۔ ہم جب تک ایک بار آپس میں مل نہیں لیتے تھے ہمیں قرار نہیں آتا تھا۔ ہمارے گھروں سے بس ذرا سے فاصلے پر ہی زرینہ بیگم کا گھر تھا۔ بہت ہی چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا بوسیدہ کھپریل کی جھکی ہوئی چھت اور پھوس کی ٹٹیوں سے گھرا ہوا جس کے اندر صرف غریبی اور محرومی تھی۔ اس جھونپڑی نما مکان میں زرینہ بیگم اپنے اکلوتے جوان بیٹے راحیل کے ساتھ بہت ہی افلاس زدہ زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کے شوہر صمد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ صمد صاحب کسی پرائمری اسکول میں ٹیچر تھے۔ قدرت نے انہیں راحیل کی شکل میں صرف ایک ہی اولاد دی تھی۔ راحیل بہت ہی خوبصورت اور بھولا بھالا تھا۔ صمد صاحب کو اس سے بے انتہا محبت تھی۔ انہوں نے اس کے کچھ بڑھتے ہی اپنے ذہن کے اندر اس کے ایک تابناک مستقبل کا نقش تیار کر لیا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلا کر اس کے ہونٹوں پر کائنات کی ساری مسکراہٹ سجا دینا چاہتے تھے۔ اپنی مختصر سی تنخواہ کے باوجود بیٹے کے لئے ان کے حوصلے بہت ہی بلند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اسے ایک شاندار زندگی نصیب ہو اور اس کا نام دنیا کے کونے کونے میں چاند ستاروں کی مانند روشن ہو۔ یہ سوچ کر انہوں نے اپنی زندگی کی کل پونجی اس پر صرف کرنے کی ٹھان لی۔ مگر راحیل ان کی امیدوں پر پورا نہیں اترا اور اس نے باپ کے تمام ارمانوں پر

پانی پھیر دیا۔ اس لئے کہ پڑھائی میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ اسکول کے اوقات میں وہ فلم دیکھنے نکل جاتا تھا اور گھر میں استاد آتے تو انہیں چکمہ دے کر نکل جاتا۔ صمد صاحب اسے ڈانٹتے پھٹکارتے۔ زرینہ بیگم قسمت کو روتی رہتیں۔ مگر اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ والدین کی ہزار ہا کاوشوں کے باوجود اس نے اپنا رویہ نہیں بدلا اور پڑھائی چھوڑ کر کئی سال آوارہ گردی میں گنوا دیئے۔ وہ لفنگے لڑکوں کی طرح ادائیں دکھاتا، سگریٹ پیتا اور بات بات پر لڑکیوں کی طرح بالوں کو جھٹکا دے کر پیچھے کی طرف پھینکتا۔ یہ ایسے دکھ تھے جو صمد صاحب کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگے۔ والدین کی لاکھوں کاوشیں اسے اس کی ڈگر سے نہ ہٹا سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کی زندگی کی راہوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ امیدوں اور آرزوؤں کے دیپ بجھنے لگے اور بالآخر اکلوتی اولاد کی ذات سے وابستہ تمام تمناؤں نے دم توڑ دیا۔ ہر طرف تاریکی کے بادل چھا گئے۔ ان کی آنکھوں میں دور دور تک صرف ویرانیاں اور اداسیاں نظر آتی تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر تک نہ ملتی تھی۔ بلکہ اس کی جگہ ایک کبھی ختم نہ ہونے والی ایسی پیاس، تڑپ نظر آتی جو کبھی نہیں بجھتی۔ وہ ایک بدنصیب اور ناکام انسان کی طرح اپنی امیدوں کے ریگستان میں تنہا بھٹک رہے تھے۔ ان کے تمام خوش رنگ اور بلند ارادوں کے پاؤں لہولہان ہو چکے تھے۔ اعتماد کی شمعیں پگھل پگھل کر دم توڑ چکی تھیں۔ احساسات کا دل حالات کے نکیلے نیزوں سے چھلنی ہو چکا تھا اور راحیل کا تابناک مستقبل ان کی نگاہوں کے سامنے سے روپوش ہو چکا تھا۔ ان نامناسب حالات کے درمیان وہ اپنی کشتی حیات زیادہ دنوں تک نہیں کھینچ سکے اور ایک رات اداسیوں کی چادر اوڑھ کر اپنے بستر پر جو سوئے تو سوتے ہی رہ گئے۔

باپ کی وفات کے بعد اس بے ریا بے مروت دنیا کی تیز کھردری زمین نے بہت جلد راحیل سے اسکا تمام جوش وولولہ چھین لیا۔ وہ شہر کی سڑکوں پر کسی گداگر کی طرح مارا مارا پھرنے لگا۔ گھر کا خرچ چلانے کے لئے زرینہ بیگم نے محلے والوں کے کپڑے سینے شروع کر دیئے۔ وہ

سلائی کڑھائی کے کاموں میں ماہر تھیں اپنے اس ہنر کے ذریعے وہ اتنا حاصل کرلیتیں جس سے گھر میں ایک وقت چولھا جل جاتا اور روکھی سوکھی روٹیوں سے پیٹ کا ایندھن بجھالیا جاتا۔ اس سال میں اور یمی دونوں ہی میٹرک میں تھے۔ یمی ایک انتہائی نیک، مہذب اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ ان کی ماہانہ آمدنی تو اوسط درجے کی تھی مگر شرافت اور انسانیت میں ان کا گھرانا بے مثال تھا۔ گرچہ وقت کے تقاضے کے تحت جدید طرز زندگی کے شفق رنگ نے ان کے گھر پر بھی گلکاریاں کی تھیں مگر انہوں نے اس کے رنگ میں بالکل ڈوب کر اپنی شخصیت کو بے رنگ نہیں کیا تھا۔ خاندان کے سبھی افراد خوش مزاج، نرم خو اور خوش گفتار تھے۔ انہوں نے سادگی کی پرکاری کے ساتھ فیشن اور آرائش کو کچھ اس طرح اپنایا تھا کہ خودنمائی کا گمان نہ گزرے۔ ان لوگوں کے لئے معیار زندگی کا اپنا ایک الگ پیمانہ تھا جسے کسی قیمت پر چھلکنے کی اجازت نہ تھی۔ یعنی مشرقیت ان کا مسلک تھا اور مغربیت وقت کا تقاضہ۔ اس لئے ان کا گھر قدیم اور جدید طرز حیات کا مرقع سمجھا جاتا تھا۔ بہت ہی غیرت دار اور غیرت مند لوگ تھے جنہیں مرجانا تو پسند تھا مگر اپنی کوئی قابل اعتراض تشہیر پسند نہ تھی۔

ایک دن میں اور یمی اسکول سے واپس آرہے تھے کہ اچانک ہی تیز بارش شروع ہوگئی جس سے بچنے کے لئے ہم لوگ زرینہ بیگم کے گھر کے اندر چلے گئے۔ ویسے بھی گھر نزدیک ہونے کی وجہ سے ہم لوگ ان کے یہاں کبھی کبھی چلے جایا کرتے تھے۔ اس وقت زرینہ بیگم سلائی کے کاموں میں مصروف تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے پژمردہ چہرے پر کچھ وقفوں کے لئے مسرت کی لکیریں پھیل گئیں۔ انہوں نے بڑی محبت سے ہم لوگوں کو پاس بٹھایا اور چائے بنا کر لے آئیں۔ ان کے اردگرد ہاتھوں کی کڑھائیوں کے کام بکھرے پڑے تھے جنہیں ہم لوگ پرشوق نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ہماری دلچسپی کو دیکھ کر انہوں نے کہا۔ اگر تم لوگ چاہو تو اپنے والدین سے اجازت لے کر کچھ دیر کے لئے یہاں آجایا کرو۔ میں تم لوگوں کو یہ کام مفت میں سکھا دیا

کروں گی۔ اس طرح تم لوگوں کو ایک ہنر آجائے گا اور میری تنہائی کا احساس بھی کچھ کم ہو جائے گا۔ ہمیں اس کام کے لئے اپنے اپنے گھروں سے اجازت مل گئی اور ہم نے اپنے فرصت کے اوقات میں ان کے یہاں روزانہ جانا شروع کر دیا۔ ہم لوگ اپنے شوق اور محنت کے جذبے کے تحت ان سے یہ ہنر سیکھتے رہے۔ اس وقت ہمارے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ معصوم سیمی کا بے پناہ حسن آہستہ آہستہ راحیل کے دل کے اندر اسے حاصل کر کے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کا ایک زہریلا بیج بو رہا ہے۔ سیمی ایک شریفانہ اور مہذب ماحول کی لڑکی تھی۔ شاید اسی لئے اس نے راحیل کی آنکھوں میں خود کے لئے ناچتی ہوئی ہوس کی پرچھائیوں کو بہت جلد دیکھ لیا اور اس گھر کے طور طریقوں نے اس کے دل کے اندر یہاں کے لئے ایک نامعلوم خوف پیدا کر دیا۔ تب اس نے زرینہ بیگم کے یہاں جانا بہت کم کر دیا۔ راحیل جس قدر اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی اس سے دور ہو جاتی۔ اس کی اس بے اعتنائی، لاپروائی اور بے رخی سے وہ بوکھلا اٹھا اور اسے پانے کے لئے اس نے خود کو بدلنے کی کوشش شروع کر دی۔ آوارہ گردی چھوڑ کر دوبارہ اسکول میں داخلہ لے لیا اور میٹرک کے امتحان کی تیاری کرنے لگا مگر اس کی یہ تبدیلی بھی جب سیمی کو اس کے قریب نہ لا سکی تو ایک دن وہ زرینہ بیگم کے سامنے تقریباً گڑگڑانے لگا۔ ''ممی میں سیمی کو بہت پسند کرنے لگا ہوں اور اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم اسے کسی طرح میرے قریب کر دو۔ اسے یہ یقین دلا دو کہ میں ایک نیک دل اور اچھا انسان ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ سیمی کو پانے کے لئے میں اپنی تمام بری عادتیں ترک کر دوں گا۔''

راحیل زرینہ بیگم کا بیٹا تھا اور وہ کیسا تھا زرینہ بیگم اس کی باتوں سے بخوبی واقف تھیں۔ مگر ممتا کے اندھے پیار نے انہیں راحیل کی طرف سے ایک نئی زندگی کی آس بندھا دی کہ شاید اس بھولی بھالی لڑکی کی کشش اسے سیدھے راستے پر چلنے کے لئے مجبور کر دے اور اس گھر کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو کنارہ نصیب ہو جائے۔ اس امید کو اپنے دل کے اندر جگہ دے کر انہوں نے

اس حصار کو توڑ ڈالنے کا عزم کرلیا جو یمی نے اپنی شخصیت کے اردگرد کھینچ رکھا تھا۔ اس عزم کے تحت وہ یمی کے دل میں راحیل کے لئے آہستہ آہستہ جگہ بنانے کی کوشش کرنے لگیں۔ یمی کو زرینہ بیگم سے اس لئے ایک خاص قسم کی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی کہ اسے اس بات کا احساس تھا کہ زرینہ بیگم اپنی اکلوتی اولاد کے ناخلف نکل جانے کی وجہ سے اندرونی طور پر بالکل ٹوٹ چکی تھیں۔ اسی ہمدردی کا سہارا لے کر انہوں نے اپنا جال پھیلانا شروع کردیا اور یہ بات اس کے ذہن میں اتارنے لگیں کہ راحیل کو اس سے اس قدر محبت ہوگئی ہے کہ اب اس نے اس محبت کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی زندگی کی ڈگر کو بدلنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ایک تو کچی عمر کی اٹھان، دوسرے زرینہ بیگم کی میٹھی میٹھی محبت آمیز دل کو لبھانے والی باتیں۔ یمی ان کے بچھائے جال میں اسیر ہوتی چلی گئیں اور اس کا دردمند دل رفتہ رفتہ راحیل کے مردانہ حسن کی طرف مائل ہونے لگا۔ اس جذباتی لگاؤ کو دیکھ کر زرینہ بیگم انہیں زیادہ سے زیادہ تنہائی میں ملنے کا موقع دینے لگیں۔ زرینہ بیگم کی عیاری کی آڑ میں پیار و محبت کے اس پوشیدہ کھیل کی بھنک بھی یمی کے والدین کو نہ مل سکی۔ اور نوعمری کے پیار کا پودا زرینہ بیگم کی پوشیدہ چھاؤں میں پروان چڑھتا رہا۔ میں یمی کی رازدار تھی۔ اس لئے مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ مگر سب کچھ جاننے کے باوجود میں صرف اس لئے خاموش رہ گئی کہ راحیل کی زندگی کی حیرت انگیز تبدیلی نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ راحیل کو واقعی میں یمی سے سچی محبت ہے اور زرینہ بیگم اس کی اس لئے احسان مند ہیں کہ جو کام وہ تمام عمر نہ کرسکیں وہ یمی کی معصوم محبت نے کچھ ہی دنوں میں کر دکھایا تھا۔ اس کی ساحرانہ کشش نے ان کے برباد بیٹے کی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ میں اپنی جگہ مطمئن تھی کہ راحیل راہ راست پر آچکا ہے۔ وہ جوان خوبصورت اور پرکشش ہے۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے وقت آنے پر یمی کے والدین کو اس رشتے سے انکار نہ ہوگا۔ اور پھر نہ جانے قدرت کا یہ کون سا کرشمہ تھا کہ یمی کے پیار کو پاکر راحیل کی زندگی جو بدلی تو بدلتی ہی چلی گئی۔ چند سال بڑی تیزی

سے گزر گئے۔ راحیل نے بی۔اے کرنے کے بعد بینک کے مقابلے کا امتحان دیا اور امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ اس کامیابی کے فوراً ہی بعد ایک سرکاری بینک میں اسے سروس مل گئی۔ ایک دن صبح سے ہی مجھے تیز بخار نے آ گھیرا اور میں سیمی کے ساتھ زرینہ بیگم کے یہاں نہ جا سکی۔ اس روز سیمی تنہا ہی چلی گئی۔ اتفاق سے زرینہ بیگم اس وقت بازار گئی ہوئی تھیں اور راحیل گھر میں تنہا تھا۔ سیمی جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوئی اسے تنہا دیکھ کر راحیل نے آگے بڑھ کر دروازہ اندر سے بند کرلیا اور پھر تنہائی کا سہارا پا کر اس کے اندر کا چھپا شیطان اپنا خول توڑ کر باہر نکل آیا۔ ایک عرصہ سے اس کے اندر کی دبی ہوئی گھناؤنی خواہشوں نے اپنا سر ابھارا۔ ایک تو اٹھتی جوانی کے پیار کا خمار اور شادی ہو جانے کی امید۔ ان باتوں نے سیمی کے قدم بھی ڈگمگا دیئے۔ وہ راحیل کو روک نہ سکی۔ پھر وہ طوفان آکر گزر گیا جسے نہیں آنا چاہئے تھا۔ سیمی کو جب ہوش آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ مارے احساس ندامت کے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور اس کی رگوں میں بہنے والا ایک انتہائی شریف خاندان کا خون آنسو بن کر اس کی آنکھوں کی راہ سے بہہ کر اس کے حسین چہرے کو داغدار بنا رہا تھا۔ راحیل نے کسی طرح سمجھا بجھا کر اسے گھر جانے کو کہا۔ مگر وہ گھر جانے کی بجائے میرے پاس آ گئی۔ اور بے تحاشہ رو رو کر مجھ سے اپنے لٹ جانے کی پوری کہانی کہہ ڈالی۔ یہ سب سن کر میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب میرے حواس کچھ بجا ہوئے تو میں نے اسے دلاسہ دے کر سمجھایا کہ وہ اس شرمناک واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ بلکہ زرینہ بیگم کو سب کچھ بتا کر ان سے التجا کرے کہ وہ شادی کے لئے اس کے والدین سے رجوع کریں ورنہ وہ کہیں کی نہ رہے گی۔

زرینہ بیگم بازار سے ہو کر جب گھر واپس آئیں تو گھر کے اندر اچانک آ جانے والے طوفان کے گزر جانے کے بعد کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ راحیل کا اترا ہوا خوف زدہ چہرہ دیکھ کر ان کی زمانہ شناس نگاہوں نے کچھ بھانپ لیا تھا۔ مگر وہ خاموش رہیں۔ انہوں نے راحیل کو

کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راحیل کے راہ راست پر آجانے کے بعد مہذبانہ طرز زندگی نے اس کے مردانہ حسن کو دوبالا کر دیا تھا اور بینک کی سروس ہوجانے کی وجہ سے زرینہ بیگم کے پاس اس کے لئے گاہے بگاہے اونچے گھرانوں سے رشتے آنے لگے تھے۔ ان اونچے گھرانوں کے رشتوں کے درمیان گھر کران کے ذہن سے ایک معمولی کلرک کی لڑکی یسی کی تصویر دھندلانے لگی تھی اور ان کی نگاہوں میں وہ لڑکیاں سمانے لگی تھیں جو اپنے ہمراہ ڈھیر سارا جہیز بھی لانے والی تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مایوسیوں اور محرومیوں کی آگ میں جھلتے ہوئے گزارا تھا۔ اب قدرت کی طرف سے انہیں ایک سنہرا موقع ہاتھ لگا تھا جس کا فائدہ اٹھا کر وہ اپنی زندگی کے سوکھے تپتے ریگستان میں پربہار امیدوں کے پھول کھلا سکتی تھیں۔ یسی کو جب ان باتوں کی کچھ بھنک ملی تو اس پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ ایک دن تنہائی میں وہ پھوٹ کر روتی ہوئی زرینہ بیگم کے پاؤں پر گر پڑی اور ساری باتیں ان سے بیان کرنے کے بعد ان سے التجا کرنے لگی۔ آنٹی مجھے بچا لیجئے۔ آپ کے اشاروں پر ہی میں نے راحیل کے اوپر بھروسہ کیا تھا ورنہ میں تو ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ آپ اگر راضی ہوجائیں گی تو راحیل ضرور مجھ سے شادی کرلے گا۔ مگر یسی کی اس دردبھری التجا کا خودغرض زرینہ بیگم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کے خوبرو ہینڈسم بیٹے کے لئے شہر کے کمشنر زیدی صاحب کی حسین وجمیل بیٹی نازیہ کا رشتہ آیا تھا جسے وہ دل سے قبول کرچکی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے بہت ہی سفاکانہ لہجے میں یسی کو جھڑک دیا۔ تم کوئی دودھ پیتی بچی تو نہیں تھیں کہ اپنا اتنا بھی بھلا برا نہیں سوچ سکتی تھیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ جذبات کی رو میں بہہ کر تم اس طرح اپنی عزت اور عصمت لٹا بیٹھوگی۔ مجھے ان لڑکیوں سے سخت نفرت ہے جو پیار ومحبت کی آڑ لے کر ہوس کے سمندر میں کود پڑتی ہیں۔ جب تم نے اپنے شریف خاندان کی عزت کا خیال نہیں کیا تو اس بات کا کیا بھروسہ ہے کہ تم ہمارے گھرانے کی عزت وآبرو خاک میں نہیں ملادوگی۔ اتنا کہہ کر زرینہ بیگم غصے میں بھری ہوئی وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے قاتلانہ

الفاظ نے غمزدہ یسمی کے شیشۂ دل کو لمحہ بھر میں ہی چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ اس خودغرض دنیا میں زندہ رہنے کا حوصلہ ہار بیٹھی اور احساس گناہ اور ذلت کو اپنے دل کے اندر چھپائے اور ایک لفظ کہے بغیرہ وہ اپنے گھر واپس چلی گئی اور اسی رات خواب آور گولیوں کی ایک بڑی مقدار کھا کر اپنے بستر پر گر گئی۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ میں نے یسمی کی موت کی خبر سنی اور پھپھک کر رو پڑی۔ اس کی موت کا راز کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔ گھر والوں نے بدنامی کے ڈر سے لوگوں کو یہی بتایا کہ رات میں اچانک ہی اسے اپینڈکس کا درد اٹھا اور اس سے قبل کہ اسپتال لے جایا جاتا اپینڈکس پھٹ جانے کی وجہ سے اس کا انتقال ہوگیا۔ میں نے اپنے گھر کی چھت پر سے سب کچھ دیکھا۔ مگر اس کے گھر جانے کی مجھ میں ہمت نہ ہوسکی اور یسمی کا جنازہ چار کاندھوں پر سوار ہوکر اپنی آخری منزل کے لئے روانہ ہوگیا۔

کچھ دنوں کے بعد راحیل کی شادی کمشنر صاحب کی لڑکی کے ساتھ دھوم دھام سے ہوگئی۔ آج زرینہ بیگم کو زندگی کی تمام نعمتیں حاصل ہیں اور وہ اپنی پر مسرت دنیا میں اس طرح مسرور اور شاداں جی رہی ہیں جیسے کہ کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو اور میں اپنی پیاری سہیلی کی دردناک موت کو یاد کر کے اکثر دل ہی دل میں خون کے آنسو روتی رہتی ہوں۔

☆☆☆

حدِّ وفا

سن سن کرتی گرم اور تاریک رات بھاگتی چلی جارہی ہے۔ شب کی خونیں پری دف بجا رہی ہے۔ ماحول پر ہر طرف ایک طویل سناٹے کا راج قائم ہے۔ مگر نیند میری آنکھوں سے اب بھی کوسوں دور ہے اور دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ صرف ایک نام میری سماعت سے ٹکرا رہا ہے۔ چاندنی، چاندنی، چاندنی کبھی میری متاعِ حیات اور کُل کائنات تھی۔ وہ میری تاریک اور ویران زندگی میں روشنی کی ایک ٹھنڈی اور میٹھی کرن بن کر داخل ہوئی تھی۔ اس نے میری خزاں رسیدہ زندگی کی راہوں کو ایک پھول بن کر اپنی بھینی بھینی خوشبو سے معطر کردیا تھا۔ چاہت کی یہ تحریک چاندنی کی طرف سے ہوئی تھی جس کا سہارا پاکر میں اس کی طرف جھکتا چلا گیا تھا کیونکہ چاہت کی آگ ایک ایسی آگ ہوتی ہے جو ہر انسان کے لاشعور کے اندر کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ رہتی ہے۔ یہ آگ کسی کمزور ساعت کا سہارا پاتے ہی پوری شدت کے ساتھ سلگ اٹھتی ہے اور پھر چاہت کی دیوانگی انسان کو ایک ایسی منزل سے آشنا کردیتی ہے جہاں پہنچ کر وہ سارے زمانے سے بے نیاز و بے گانہ ہوجاتا ہے، مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاہت بھری ان راہوں پر چلتے

چلتے کہیں پر ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے جو اسے گناہ کی وادی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور ایسے وقت میں وہ صرف اعلیٰ انسان ہی ہوتے ہیں جو ان راہوں پر گامزن ہونے کے باوجود خود کو گناہوں کی دلدل سے بچالیتے ہیں اور تب ان کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ محبت کتنا عظیم جذبہ ہے۔ یہ قدرت کا وہ بیش بہا عطیہ ہے جو انسان کو جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے اور انسانیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ زندگی کتنی بے معنی ہوتی ہوگی جو اس جذبے سے ناآشنا ہو۔

چاندنی جس وقت اپنی بھولی بھالی شخصیت کے ساتھ میری زندگی میں داخل ہوئی تھی اس وقت میں ایم۔بی۔بی۔ایس کے آخری سال میں تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات ایک سینئر ڈاکٹر کے کلینک میں ہوئی تھی۔ اس ڈاکٹر سے میری پرانی جان پہچان تھی۔ میں اس سے اپنے کورس کے چند اہم سوالات حل کروانے کی غرض سے گیا تھا اور چاندنی اپنے چھوٹے بھائی کے چیک اپ کے لئے آئی تھی۔ اس جگہ کی ہوئی ایک چھوٹی سی ملاقات اور رسمی سی گفتگو آگے ملنے کا ایک ذریعہ بن گئی۔ تیکھے نقوش اور سانولے رنگ والی چاندنی جو مشرقیت کی خوشبو میں لپٹی ہوئی ایک پاکیزہ کلی معلوم ہو رہی تھی وہ پہلی ہی نظر میں میرے دل کے اندر اتر گئی تھی۔ اس کے بھولے بھالے چہرے پر ایک ایسا پاکیزہ نور بکھرا ہوا تھا جو مریم اور سیتا کے تقدس کا پتہ دے رہا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں سوچا تھا کہ ڈاکٹر کے کلینک میں ہوئی یہ مختصر سی ملاقات اس کامنی سی لڑکی سے میری آخری ملاقات ہوگی۔ مگر جب کلینک سے باہر نکل کر وہ اپنی چھوٹی سی ماروتی میں بیٹھنے لگی تو اس نے مجھ سے میرا پتہ پوچھ لیا۔ میں نے اسے اپنے ہوسٹل اور کالج کا پتہ نوٹ کروادیا۔ کئی روز ہوگئے مگر اس سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میں اس سے ہر لمحہ ملنے کے لے بے تاب تھا۔ اس کا تصور صرف یہی سوچتا رہتا تھا کہ کاش چاندنی سے ایک بار اور ملاقات ہوجائے اور پھر اس روز میری مسرت کی کوئی انتہا باقی نہ رہی جس روز اس کی کار میرے گیٹ پر آکر رکی۔ وہ شام ہم نے ایک ساتھ گزاری تھی۔ وہ مجھ سے اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے کہ برسوں کی شناسائی ہو۔

جیسے ہم ایک دوسرے سے سالہا سال سے ملتے چلے آرہے ہوں۔ اس روز وہ مجھے اپنے گھر لے گئی تھی اور پھر اس ملاقات کے بعد ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ہم برابر ملتے رہے اور ایک ساتھ تمام تفریح گاہوں کی سیر کرتے رہے۔ اس درمیان میرے دل کو یہ احساس ہوتا رہا کہ وہ مجھ میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے۔ ان ہی ملاقاتوں میں ایک ملاقات وہ بھی ہوئی تھی جب ایک ریسٹورینٹ کے تنہا گوشے میں بیٹھ کر میں نے اس کے نرم و نازک ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہہ دیا تھا کہ مجھے اس سے بے انتہا محبت ہوگئی ہے اور میں نے اسے اپنی زندگی کا شریک سفر بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ شرم وحیا کی وجہ سے گلنار ہوگیا تھا اور اس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ پر سے آہستہ سے علیٰحدہ کرلیا تھا۔

اس وقت مجھ پر اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوگیا تھا کہ وہ ظاہری اور باطنی حسن کے خزانۂ بیش بہا سے مالا مال تھی۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت نے اس کا انداز تکلم مرعوب کن حد تک خوبصورت بنایا تھا۔ والدین کی شاندار تربیت نے اس کا کردار سنوارا تھا اور انسانیت پر مبنی اصولوں نے اسے سب کا منظور نظر بنا دیا تھا۔ خدا نے اسے حسن تو بخشا ہی تھی۔ اس پر فطری حیا اور کم گوئی نے اس کے حسن بے مثال میں چار چاند لگا دیا تھا۔ یہ تھی وہ عمدہ اور بے مثال شخصیت جس نے مجھ جیسے معمولی انسان کو لائق التفات سمجھا تھا۔ کاش میں محبت کے ساتھ اس لائق احترام شخصیت کا احترام کرنا جانتا تو آج تنہائی اور محرومیت کے احساس کا ناگ میرے وجود کو نہ ڈستا اور میرے دل کے اندر بسا ہوا محبت کا نشیمن تنکے تنکے ہو کر نہ بکھرتا۔

وہ موسم سرما کی ایک شام تھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کے سنسناتے ہوئے جھکڑ ہر طرف چل رہے تھے۔ صبح سے پڑنے والی بوندا باندی نے ہر طرف منجمد اداسی کی ایک چادر سی تان دی تھی۔ ایک ہفتہ قبل چاندنی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے والدین شادی کی ایک تقریب میں شرکت کی غرض سے کہیں باہر جارہے ہیں۔ میرا امتحان قریب ہے۔ اس لئے میں ان کے ساتھ نہ جاسکوں

گی۔ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ یہیں رہوں گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے مجھ سے نہیں مل سکی تھی۔ اس شام نہ جانے کیا بات تھی کہ اچانک ہی چاندنی سے ملنے کے لئے میں بے قرار ہو اٹھا اور شدید ٹھنڈ کے باوجود میں اس کے مکان کی طرف چل پڑا۔ راستے بھر میں اس کے حسین تصور میں کھویا رہا اور بالآخر اس کے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا اور ہلکی سی دستک دے دی۔ دستک پڑتے ہی اندر سے چوڑیوں کی مدھم سی کھنک سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نظر چاندنی پر پڑی۔ اس نے گلابی رنگ کے نرم سے شال میں خود کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے ریشمی بال چاروں طرف سے اس کے چاند سے چہرے کا ہالہ کئے تھے۔ اس کی نظریں نیچی تھیں اور سر جھکا ہوا تھا۔ پھر بھی مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے نازک سے گلابی ہونٹوں پر مسرت کی ایک لکیر پھیل گئی۔ وہ مجھے بڑے ہی انہماک کے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے کر آئی۔ جب میں صوفے پر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گیا تو وہ میرے لئے چائے لانے اندر چلی گئی۔ میں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھنے میں محو تھا کہ چاندنی چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔ مدھم سی نیلگوں روشنی میں سر پر آنچل ڈالے اس نے میرے سامنے چائے کی پیالی بڑھا دی۔ میں نے چائے کا کپ اس کے ہاتھوں سے لے لیا اور وہ قریب بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

نہ جانے یہ اس کی محبت آمیز باتوں کی مدہوشی تھی یا سرد موسم کا تقاضہ یا جذبات کی گرمی جس نے اچانک ہی تنہائی کے احساس کو جگا دیا۔ اور پھر جیسے میں سب کچھ بھول گیا۔ اگر مجھے کچھ یاد رہی تو صرف چاندنی کی قربت اور اس کی محبت، جس نے میرے اندر کے چھپے ہوئے شیطانی ہوس کو اپنے خول سے باہر نکال دیا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ چاندنی کچھ سمجھ پاتی میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں جکڑ لیا۔ اگر چاندنی مشرقی ماحول کی پروردہ نہ ہوتی یا اس کے دل کے اندر مشرقی حیا و غیرت کا احترام نہ ہوتا تو شاید اس روز شرافت ایک درندے کے ہاتھوں ذبح ہو جاتی۔ مگر دفعتاً مجھے ایسا لگا کہ جیسے چاندنی کا وجود چاند کی ٹھنڈی، میٹھی اور شیتل کرنوں کا بنا ہوا نہ

تھا۔ بلکہ وہ تو ایک بجلی تھی جس نے مجھے اتنی زور سے جھٹکا دیا تھا کہ میں اس سے الگ ہو کر سامنے کی دیوار سے جا ٹکرایا تھا اور پھر میرے بیٹھنے سے پہلے اس نے کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج کر کہا تھا، آئندہ آپ مجھ سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کریں گے۔ میں اس شخص کو اپنی پاک محبت کے قابل نہیں سمجھتی جسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ پاکیزگی اور عفت کا زیور مشرقی لڑکیوں کے لئے حدوفا ہے جسے زندگی میں کبھی مجروح نہیں ہونا چاہئے۔

چاندنی کے گھر سے نکلتے وقت جب میں نے آخری نظر اس پر ڈالی تو دیکھا کہ اس کی سیاہ پلکوں پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ ماہتابی چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ لرزتے کانپتے لب دھلے لٹھے کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ وہ سرتاپا زخم خوردہ سی لبوں کو بھینچتی رعشہ زدہ ہاتھوں کو مسلتی ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے دروازے تک آئی۔ ایک قہر آلودسی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اس نگاہ میں میرے لئے بے پناہ نفرت وحقارت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ میں جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا اس نے ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اس نفرت کے شعلے میں جل کر بھسم ہو گیا۔ اس آگ نے میری طمانیت ہستی کو تہ وبالا کر ڈالا تھا۔ ایک بھیانک طوفان تھا جو میرے پورے وجود میں برپا ہو گیا تھا۔ انجانے ہی میں ایک ایسا بھونچال اٹھ کھڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے میری شخصیت کی دھجیاں بکھر گئی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دل کا مکان کھنڈر ہو گیا تھا۔ میں ہوسٹل کی طرف جانے والا راستہ طے کر رہا تھا اور تمام راستے ایک خاموش چیخ بن کر میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ اور میرا زخمی دل بار بار مجھے یہ احساس دلا رہا تھا کہ میرے ہوس انگیز قدم نے کس طرح ایک محبت بھرا دل روند ڈالا تھا۔ اور میری کورنگاہی نے خود مجھے ہی نیست ونابود کر ڈالا تھا۔ اس رات ہوسٹل کے کمرے میں میں تمام رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک کربناک سوچ نے میری روح میں زخم ہی زخم بھر دیا تھا۔ ان زخموں سے دل کا لہو قطرہ قطرہ ہو کر یوں رس رہا تھا کہ میری پوری زیست لہولہان ہو گئی تھی۔ اپنی متاع

حیات خود اپنے ہی ہاتھوں گنوا بیٹھنے کا غم مجھے اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا تھا۔ یہ سزا تھی ایک معصوم اور نازک کلی کے پاکیزہ احساسات کو پامال کرنے کی۔ نہ جانے میرے اس نازیبا فعل نے اس کی روح میں کیسا شگاف پیدا کر دیا ہوگا۔ اس شگاف کا کوئی مداوا نہ تھا۔

اس روز کے بعد آج تک میری آہوں کا دھواں میری ہر رات کی سیاہی میں تحلیل ہوتا رہتا ہے اور میں اپنی ذات سے بیگانہ صرف چاندنی کی عطا کردہ زخموں کی سوغات کا اندازہ کرتا رہتا ہوں۔ یہاں تک کہ سورج کی زرد کرنیں میرے کمرے کے اندر اتر آتی ہیں۔ مگر یہ روشن اجالا بھی میرے لئے صرف ظلموں کا پیغام ہی لاتا ہے۔ اب میری زندگی میں کبھی بہار نہ آئے گی۔ میری زیست تو ہمیشہ کے لے خزاں کی نذر ہو چکی ہے۔ میں نے ایک قیمتی اور انمول ہیرا خود اپنے ہی ہاتھوں گنوا دیا ہے۔

☆☆☆

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

صبح کی چہل قدمی کے بعد گھر واپس آ کر میں باہری گیٹ کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک سفید چمچماتی ہوئی نئی کار جھٹکے سے آ کر گیٹ کے پاس رک گئی۔ اس کار کے اندر سے ایک خوبرو نوجوان فوجی افسر کے ڈریس میں ملبوس باہر نکلا اور اپنا بھاری بھرکم فوجی بوٹ چرمراتا ہوا میرے بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر اس نوجوان کا جائزہ لیا جس کے چہرے پر زندگی کی کامیابی کی ایک دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ تندرست و توانا لمبا تڑنگا یہ نوجوان جو میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ مگر مجھے اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ میری بوڑھی نگاہیں اس کے سراپے میں کوئی گم شدہ سا عکس تلاش کرنا ہی چاہ رہی تھیں کہ اس نے بڑے ہی مہذبانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

''میرے محترم بزرگ، کیا آپ زحمت کر کے مجھے یہ بتائیں گے کہ کیا شہنواز منزل یہی ہے؟'' اس کے اس سوال پر میری دھندلی نگاہیں اس کھنڈر نما حویلی کے اس اوپری حصے پر جا کر ٹک گئیں جہاں کبھی شہنواز منزل اس طرح تحریر تھی جیسے موتیوں کے دانے بکھرے ہوں۔ مگر اب وقت کے خوفناک پنجے نے اس تحریر کو اس طرح مٹا ڈالا تھا کہ اب اسے صرف میں ہی پڑھ سکتا تھا،

یہ شہنواز منزل ہے۔

یہ گزرے ہوئے کل کی بات ہے کہ شہنواز منزل اپنی بلندی اور شان وشکوہ کی بدولت آنے والوں کو خود اپنا پتہ بتا دیتی تھی۔ آج تو اس عظیم الشان حویلی کے گرتے ہوئے ملبے اور ٹوٹتی ہوئی دیواروں کے قریب کھڑے ہو کر ایک نئی نسل اس کے نام کا نشان ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ نئی نسل کا نوجوان اپنا آسان سا سوال لے کر میرے جواب کا منتظر تھا۔ میں نے اپنے دل کے اندر اٹھنے والے طوفان کو اندر ہی دبا کر اسے جواب دیا۔ ''ہاں بیٹے اسے ہی شہنواز منزل کہتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی اس کی خوبصورت آنکھوں میں ایک ایسی چمک ابھری جو کسی کی آنکھوں میں اپنی منزل مقصود کو قریب دیکھ کر ابھرتی ہے۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے بے حد نرم اور شگفتہ لہجے میں کہا ''غالباً آپ ہی اس عمارت کے تنہا وارث ہیں۔ ہمیں فوجی کیمپ کے لئے اس عمارت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ اسے فروخت کرنا چاہیں تو ہم آپ کو اس کی منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں۔'' میرے سینے کے اندر ایک درد سا اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ میں اس جوان سے اتنی ہی دیر میں اپنے لئے ایک جذباتی لگاؤ سا محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے میں نے بڑی مشکلوں کے بعد اسے جواب دیا۔

''بیٹا اسے فروخت کرنے کا کوئی ارادہ تو نہیں ہے مگر تم اسے ایک نیک مقصد کے لئے خریدنا چاہتے ہو اس لئے میں اس امر پر کچھ غور کر کے تمہیں ایک ہفتے کے بعد اس کا جواب دے سکوں گا۔'' ''کوئی بات نہیں میں ایک ہفتے کے بعد دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ خدا حافظ۔'' اس نے اتنا کہا اور کار اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ کار کے پیچھے اٹھنے والے غبار میں میری نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ جب اس کی کار نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں اندر آ گیا۔ تمام دن میں خاموش برآمدے میں پڑی ایک چارپائی پر بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ دن تمام ہونے لگا اور شام رات کے پیکر میں ڈھل گئی۔ چاروں طرف ایک خوفناک سناٹے کا راج قائم ہونے لگا اور میں شہنواز منزل کے اس کھنڈر میں تنہا رہ گیا۔ پاس کے ہوٹل سے آیا ہوا دونوں

وقت کا کھانا اسی طرح رکھا تھا۔ میری بھوک مر چکی تھی اور آنکھوں سے نیند بھی غائب تھی۔ اس نوجوان فوجی کی مختصر سی ملاقات نے اس وقت میری روح کو ایک کرب واذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بغیر کھانا کھائے میں بستر پر ڈھیر ہو گیا اور ذہنی سکون کی خاطر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند آنکھوں سے دور ہی ہوتی چلی گئی۔ دفعتاً ہی کہیں سے آوارہ بادل کا ایک ٹکڑا نیلے آکاش کی بلندیوں میں منڈلانے لگا جس کی وجہ سے ٹھنڈی یخ ہوا کے جھونکے میرے رخساروں سے ٹکرانے لگے۔ میں نے بستر سے اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں تاکہ ننھی ننھی بوندوں کی پھواریں اندر آسکیں۔ اور میرے جلتے ہوئے ادھورے خواب کو کچھ ٹھنڈک پہنچا سکیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سی یہ ہوا بھولی بسری ایک داستان کو اپنے ساتھ سمیٹ لائی۔ یادیں جن سے دل کی دنیا ہمیشہ آباد رہتی ہے، جو زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ اگر انسانی دل کے اندر یادوں کے دیپ روشن نہ رہیں تو اسکی اندھیری گلیاں ہمیشہ کے لئے سناٹوں کی گود میں گم ہو جائیں۔ یا یہ دل ایک اندھا کنواں ہو جائے اگر اس میں یادوں کے کنکر نہ گرتے رہیں۔ وہ کنکر چاہے اپنے دامن میں محض تلخیاں سمیٹے ہوں یا مسرت کی پرچھائیاں۔ میرے دل کا نگر اب تک جن یادوں سے آباد ہے ان میں مسرت کی ساعتیں بہت ہی مختصر ہیں۔ زندگی کا ایک طویل حصہ محض آہوں کے درمیان گزرا ہے اور اب اس کے جھلسے ہوئے صحرا میں کسی سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ صرف شہنواز منزل کی شکستہ دیواروں سے لپٹی ہوئی چند یادیں ہیں جو زندگی کا حاصل ہیں۔ جن کے سہارے میں نے اپنی زندگی بتا دی ہے۔ اس بیتی زندگی میں آہوں اور آنسوؤں کے لاتعداد تحفے ہیں۔ ہاں ان تلخیوں کے درمیان ایک یاد ایسی ضرور ہے جو ماہتاب کی کرنوں کی طرح آج بھی دل کے نہاں خانوں کو منور کئے ہے۔ چالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر ایک آواز کی بازگشت اسی طرح میرے لاشعور سے چپکی ہوئی ہے جیسے ابھی ابھی دور کہیں فضاؤں میں سے ایک ہلکی سرگوشی ابھر رہی ہے۔ ''ردا یہ تم ہر وقت چاند میں کیا تلاش کرتی رہتی ہو۔ کیا اپنے چاند سے دولھا کو دیکھتی رہتی ہو؟'' چاند سا دولھا؟

جیسے کہیں قریب سے چاندی کی گھنٹیوں کی طرح مدھری آواز ابھری ہو۔ "ہاں روحی انہیں چاند کہنا ہی ٹھیک ہوگا کیونکہ انہیں پانے کے خواب دیکھنا تو چاند کو چھو لینے کی تمنا ہی کرنا ہے جو شاید کبھی پوری نہ ہو سکے۔" یہ آواز ردا کی ہے جو یہاں مہمان بن کر آئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب آج کی یہ کھنڈر نما حویلی شہواز منزل اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے شاہی وقار اور نوابی آن بان کی حامل تھی۔ اس کی چہار دیواری کی حدود میں موجود ہر شے یہاں کے مکینوں کے نوابی وقار اور رکھ رکھاؤ کی آئینہ دار تھی۔ ان کی مالی حیثیت کی مظہر تھی۔ امارت اور شان و شکوہ کی منہ بولتی تصویر۔ بے شک یہ اپنے وقت میں کسی شاعر کا ایسا جیتا جاگتا خواب تھی جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ جیسے آسمان زمین پر جھک آیا ہو۔ اب تو یہ وقت کے ہاتھوں اپنی آن بان کھو کر صرف یادوں کا مدفن رہ گئی ہے۔ کبھی اس کا آنگن بڑے بھیا اور بھابھی کی خوشیوں بھری زندگی سے آباد تھا۔ اسی وقت بھابھی کی چھوٹی بہن ردا کچھ دنوں کے لئے یہاں آئی تھی۔ بھولی بھالی شبنمی آنکھوں، سنہرے بالوں والی خاموش سی وہ لڑکی جو ہلکے گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس تھی، اس نسوانی پیکر کو دیکھ کر اس وقت میری نگاہوں میں بلا شبہ جنت کے نظارے مچل گئے تھے۔ ایک سیدھا سادہ سا حسن تھا۔ مگر اس میں چاند کی ٹھنڈی دل لبھانے والی روشنی ستاروں کی ہلکی ہلکی ضیاء، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، کلیوں کی نزاکت اور غنچوں کی تر و تازگی مضمر تھی۔ ایک بار اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس کے چہرے پر اضطراب کی ایک لہر اور آنکھوں میں بے خوابی کا نشان ہے۔ اس روز جب اس کی مضطرب سی نگاہیں لمحہ بھر کے لئے میرے چہرے پر ٹک گئی تھیں تو اس روز میرے دل کے اندر نہ جانے کیوں ایک انجانی خوشی اور غم کی ملی جلی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوئی تھی جس کی لذت مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس وقت بھی بھیگی رات کی یہ تنہائی میرے لئے اس انوکھی لذت کو کھینچ لائی ہے۔ آسمان پر وہ بادل کا آوارہ ٹکڑا کھل کر برسنے کو بے چین ہے۔ آج کی رات گزشتہ تمام راتوں سے مزید افسردہ کیوں ہے، جیسے کسی بیوہ کے دل کے اندر سسکتا ہوا درد یا

کسی بے بس مجبور انسان کی مردہ تمناؤں کا ماتم۔ ایسا مجبور اور بے بس انسان جو اپاہج تو ہے مگر اس کی خودداری کسی ہمدردی اور محبت کے لبادے میں لپٹی ہوئی بیساکھی کی محتاج نہیں۔ ہاں وہ مجبور اپاہج انسان میں ہی ہوں جس کے دل نے کسی انسانی بیساکھی کے سہارے کو قبول تو نہیں کیا مگر اس کی یاد ہمیشہ اس کے دل کے اندر زندہ رہی۔

دفعتاً بجلی زور سے کڑکی اور کمرہ لمحہ بھر کے لئے اس کی روشنی سے چمک اٹھا۔ لمحہ بھر کی اس روشنی میں ہی میری نظریں سامنے دیوار پر ٹنگی ان دو تصویروں کی طرف اٹھ گئیں جو پچھلے چالیس سالوں سے اس دیوار پر ٹنگی ہیں۔ اس کمرے میں ایک ہی جگہ، ایک تصویر ایک تندرست و توانا خوبرو فوجی افسر کی ہے۔ فوجی افسر اپنے فوجی ڈریس میں ملبوس ہے۔ اس کے ہونٹوں پر زندگی کی تازگی سے بھرپور مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ دوسری تصویر ایک نوجوان ڈاکٹر کی ہے جو سادے لباس میں ہے۔ اس کے ہونٹوں پر بھی وہی مسکراہٹ ہے جو فوجی افسر کے لبوں پر ہے۔ ان مسکراتی تصویروں کو اس وقت دیکھنے کے لئے میں نے کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ کمرہ روشنی میں نہا گیا اور میری بوڑھی آنکھیں اس وقت ان مسکراتی تصویروں کو دیکھ کر آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور وہ شعلہ جو پچھلے چالیس سالوں سے میرے سینے کے اندر دہک رہا ہے اس سے میرا جسم جل اٹھا۔ یہ جلن مجھے اس وقت کی اذیت سے تڑپا گئی جب میرا وجود اپنے دل کے اندر ایک زخم لے کر دکھوں کے سمندر میں ایسا ڈوبا کہ پھر نہ ابھرا۔ اس کمرے کی دیوار پر ٹنگی یہ دونوں تصویریں بالکل ایک ہی جیسی ہیں۔ صرف لباس کا فرق ہے۔ فوجی افسر کی تصویر میری ہے اور ڈاکٹر کی تصویر میرے چھوٹے بھائی فاران کی ہے۔ فاران میرا پیارا بھائی جو مجھ سے عمر میں صرف دو سال چھوٹا تھا۔ مگر قد و قامت، صورت و شکل اور رفتار و گفتار میں مجھ سے حیرت انگیز طور پر مشابہت رکھتا تھا۔ اس کی اور میری فطرت میں بس تھوڑا ہی سا فرق تھا۔ فاران نے شوخی اور سادگی کے ساتھ حساس فطرت پائی تھی۔ اس کے سینے کے اندر کا دل موم سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا جو اپنے ہی نہیں

دوسروں کے غم کی آنچ سے بھی پگھل جاتا ہے اور پگھل کر آنکھوں کی راہ سے بہنے لگتا ہے اور اسکے برعکس میں جد درجہ خاموش اور سنجیدہ ہونے کے ساتھ ہی بے احساس بھی تھا۔ میں بڑی سے بڑی بات کو بھی خاموشی کے ساتھ ہنس کر ٹال دیتا تھا، مگر فاران ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

عمر کی پچیسویں منزل میں قدم رکھتے ہی مجھے فوج میں ملازمت مل گئی اور فاران ڈاکٹر بن گیا۔ سامنے دیوار پر آویزاں یہ دونوں تصویریں ان ہی دنوں کی ہیں جب ہم دونوں بھائیوں نے اپنا نیا عہدہ سنبھالا تھا۔ ان دونوں تصویروں کی حیرت انگیز مشابہت دیکھ کر بھابھی دنگ رہ گئی تھیں۔ ایک ہی آنکھیں، ایک ہی ہونٹ، ایک ہی خدوخال اور بالکل ایک ہی جیسا پیشانی پر بالوں کا جھکاؤ۔ مگر اس مشابہت کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی اور صرف ایک ہی دن میں میری اور فاران کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہوگیا۔ فوج میں اپنا عہدہ سنبھالے ہوئے مجھے صرف ایک ہی سال ہوا تھا کہ جنگ چھڑ گئی اور اس خونیں جنگ نے مجھ سے میرا ایک پاؤں ہی نہیں چھین لیا بلکہ ملازمت سے بھی معطل کر دیا گیا۔ اب میں ایک اپاہج تھا۔ دوسروں کے سہارے کا محتاج۔ اس حادثے نے میری زندگی کی بنیاد ہلا ڈالی اور دل کے اندر ایک ایسا زخم پیدا ہوگیا جو وقت کے ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ان دنوں میں دیوار پر آویزاں تصویر کو اکثر تنہائی میں گھنٹوں دیکھتا رہتا اور سوچتا۔ یا خدا یہ کیا ہوگیا۔ صرف ایک پاؤں کی کمی نے مجھے اپنے ہم شکل بھائی سے کتنا جدا کر دیا تھا۔ اس احساس سے میں اتنا دل شکستہ ہوا کہ دو چیزوں سے خود بخود ہی گھبرانے لگا۔ ایک لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور دوسرے فاران کی قربت کیونکہ میرا دل اس بات کے لئے راضی نہ ہوتا تھا کہ اگر میں فاران کے ساتھ بیساکھی کا سہارا لے کر کھڑا یا بیٹھا ہوں تو دیکھنے والوں کی نظروں میں ایک ہی جیسے بھائیوں میں ایک کے لئے کسی کی نگاہوں میں پسندیدگی کا جذبہ پیدا ہو اور دوسرے کے لئے ہمدردی اور افسوس کا۔ رفتہ رفتہ میں تنہائی اور اندھیرے کا عادی ہوتا جا رہا تھا کہ اچانک ہی ایک دن ہمارے گھر نور کا ایک جھماکا ہوا اور گھر کے در و دیوار اس روشن

چہرے سے منور ہو گئے جو سیاہ نقاب الٹ کر آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ یہ بھابھی کی چھوٹی بہن ردا کا چہرہ تھا جو بغیر کسی اطلاع کے بھابھی کے پاس چند دنوں کی مہمان بن کر آ گئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر ایک پل کے لئے ساکت رہ گیا تھا۔ گلابی رنگت اور سنہرے بالوں والی ردا بالکل گڑیا سی تھی اور اپنی گہری بھوری شفاف چمکدار آنکھوں سے سبھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت یہ کسی نے نہ جانا ہوگا کہ میرا دل اچانک ہی بہت زور سے دھڑک اٹھا تھا۔ میرے ذہن میں سوچوں کے پھندے چکرانے لگے تھے اور مجھے لگنے لگا تھا کہ میری فولادی شخصیت موم کی طرح پگھلنے لگی ہے۔ گرچہ میں ایک ادھورا انسان تھا۔ مگر میرے پاس چمکتے ہوئے جذبات کا خزانہ بھی تو تھا۔ اس خزانے سے وابستہ نازک احساسات تھے۔ عمر بھر کی مسرتوں کا سوال تھا اور سنہرے مستقبل کی خواہش تھی جسے میں اپنے دل کے اندر ہی کچل دینا چاہتا تھا۔ اس احساس کو زندہ کر دینا چاہتا تھا کہ میں تو خزاں کا ایک زرد پتہ ہوں جسے محبت کی منزل تلاش کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ شاید میں اس احساس کو اپنے دل کے اندر اجاگر کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور زندگی صرف اپاہج کا ایک غم لے کر ہی گزر جاتی، مگر ایسا نہ ہوا اور زندگی میں ایک ایسے غم کا اضافہ ہو گیا جس نے ہمارے گھر کی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں خزاں کا ایک زرد پتہ ضرور تھا مگر ہوا کے ایک بے رحم جھونکے نے اسے محبت کی منزل سے آشنا کر دیا۔ مگر کاش بات بس اتنی ہی سی ہوتی اور اس سے کسی دوسرے کی زندگی کا ادھورا اور غمناک باب نہ لکھا جاتا۔ نہ جانے قدرت نے مجھے کس بات کی سزا دی تھی۔ میں نے تو زندگی میں کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا۔ پھر میں کیوں ہمیشہ کے لئے اپنے دکھ کے سناٹوں میں گم ہو گیا۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ لوگ اپنی قسمت خود بناتے ہیں۔ جو لوگ قسمت کا رونا روتے ہیں۔ میں ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رومانیت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ ایک ایسی رومانیت جو انسان کو بشر کے جامے میں رکھتی ہے۔ اس کو کسی شے سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ نہ ڈوبتی شام کی شفق سے اور نہ ابھرتی ہوئی نومولود خوشبودار صبح سے، نہ

سنسان دوپہر سے۔ مگر وہ ان سب میں سرایت رہتی ہے اور انسانی دل میں اتر جاتی ہے جو ایک کیف ہوتی ہے جسے نہ ہاتھ لگانے کو دل چاہتا ہے اور نہ چھونے کو دل چاہتا ہے۔ اسے تو بس دیکھتے رہنے کو دل چاہتا ہے۔ محسوس کرنے اور دل میں اتار لینے کو دل چاہتا ہے۔ وہ محبت جو جسم سے نہیں روح سے کی جاتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر جسمانی ضروریات ہی آسودگی کا پیمانہ ہے تو پھر سب کچھ پا لینے کے بعد بھی انسان اپنے دل کے اندر ایک تشنگی سی کیوں محسوس کرتا رہتا ہے۔

میں نے جب پہلی بار ردا کو دیکھا تھا تو اس وقت میرے دل کے اندر کچھ اسی قسم کے جذبے ابھرے تھے۔ ردا جو محض چند ہی دنوں کے لئے یہاں آئی تھی۔ مگر اس نے اپنے حسن سلوک سے سبھی کا دل جیت لیا تھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور فرشتوں جیسی پاکیزگی کو دیکھ کر اس کی ہستی کے لئے دل میں ایک احترام سا پیدا ہوتا تھا۔ لباس کی سادگی اور صفائی اس کی پسند تھی اور خاموش رہنا اس کی عادت تھی۔ اندھیری اور تنہا شب میں ایک روز میں دیوار پر آویزاں تصویروں کو محویت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے ڈھیر سارے آنسو گر کر زمین میں جذب ہو گئے تھے۔ اور میں اپنی تصویر سے سرگوشیوں میں مخاطب تھا۔ بے شک تم میرا ہم عکس ہو۔ مگر وقت نے اب ہمارے درمیان ایک ایسا فاصلہ پیدا کر دیا ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس عکس میں جو مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر کھیل رہی ہے اس مسکراہٹ کا اب میری حقیقی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا بلکہ اب تو اس عکس کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے تم میری بے بسی اور بے چارگی پر مسکرا رہے ہو۔ تم نے اپنے ہونٹوں پر کھیلنے والی اس دلکش مسکراہٹ کو اب تک محفوظ کر رکھا ہے۔ مگر میرے چہرے پر تو مایوسیوں اور حسرتوں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ شاید اب یہ ہونٹ کبھی مسکرا نہ سکیں۔ اچانک کسی کی مدھم مدھم سرگوشیوں سے میرے راز و نیاز کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں نے پائیں باغ میں کھلنے والے دریچے سے جھانک کر دیکھا۔ وہاں باغ کے ایک گوشے میں ردا اور میری چھوٹی بہن شمانہ محو گفتگو تھیں۔ یہ مختصری گفتگو آج سے چالیس سال قبل میری سماعت

سے ٹکرائی تھی۔

''ردا یہ تم ہر وقت چاند میں کیا تلاش کرتی رہتی ہو۔ کیا ایسے چاند سے دولھا کو دیکھتی رہتی ہو؟'' یہ ہماری چھوٹی سی چنچل بہن ثمانہ کی آواز تھی اور دوسری آواز ردا کی تھی۔ جیسے کوئی حسرت و یاس کے سمندر میں ڈوب کر کراہتا ہو۔ چاند سا دولھا۔ ہاں ثمانہ انہیں پانے کی تمنا کرنا تو چاند کو چھونے کی تمنا ہی کرنا ہے۔ اس وقت میں نے ردا کی اس گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھا اور اسے دو سہیلیوں کا ہنسی مذاق سمجھ کر دریچہ بند کر دیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ نیند کو منانے کی کوشش میں ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ کمرے کے آس پاس کسی کے مدھم قدموں کی چاپ سن کر میں چونک پڑا اور دروازہ کھول کر برآمدے کی طرف جھانک کر دیکھا تو ردا کو تیزی کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بھاگتے ہوئے پایا۔ اس وقت میں حیرت سے یہ سوچتا رہ گیا کہ اتنی رات گئے ردا میرے کمرے کی طرف کیوں آئی تھی؟ دل سے اس سوال کا جواب نہیں ملا اور میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ دوسرے دن شام کے وقت میری نگاہیں حیرت کے سمندر میں غوطہ کھانے لگیں۔ جب میں نے اپنی تصویر کے نیچے ردا کے ہاتھوں کا لکھا ہوا یہ شعر پڑھا ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتر ہو
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

بالکل ایک سی تصویروں میں سب کچھ جاننے اور دیکھنے کے باوجود میری ہی تصویر پر اپنی پسندیدگی کا یہ پیغام کتنے حیرت کی بات تھی۔ میں دل تھام کر بیٹھ گیا اور دل کے اندر سے جیسے خود بخود ایک آواز آئی۔ محبت، قربانی، ایثار اور بیساکھی کے عطا کردہ سہارے میں فرق ہے۔ ابھی میرا ذہن کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ نظریں سامنے کے برآمدے کی طرف ٹک گئیں جہاں پر ردا عشاء کی نماز پڑھنے میں محو تھی اور فاران اس کی پشت کی طرف اس انداز سے کھڑا تھا جیسے وہ اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔ فاران میرا بھائی جس کی شخصیت میں شہزادوں کا سا

وقار تھا۔ متین و بردبار اس وقت وہ سفید براق سوٹ میں ملبوس تھا۔ کاج میں مہکتی ہوئی گلاب کی نازک سی کلی اس کے اعلیٰ ذوق اور نفاست کا پتہ دے رہی تھی۔ سفید سوٹ پر سرخ ٹائی کسی افسانوی ہیرو کا کردار پیش کر رہی تھی۔ فاران ڈاکٹر ہونے کے ساتھ مردانہ حسن و وجاہت کا مکمل نمونہ تھا اور............اس لئے وہ ہر لڑکی کی آرزو تھا اس کا سنہرا خواب تھا۔ خاندان اور خاندان کے باہر وہ سبھی کا منظور نظر تھا۔ اکثریت کی یہ خواہش تھی کہ وہ ان کی بیٹی کا نصیب بنے۔ اسی فاران کی نگاہوں میں ردا کے لئے انتہائی پسندیدگی اور اپنائیت کی ایک خاص جھلک اس وقت میری نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ میں بت بنا اس طرف دیکھ رہا تھا۔ ردا نے نماز تمام کی اور جانماز تہہ کر کے بھابھی کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ تب ہی فاران اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ ردا اس سے کوئی سوال کرتی یا اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتی۔ فاران نے بلا جھجک اس سے مخاطب ہو کر کہا ''ردا میں بہت دنوں سے تم سے کچھ کہنے کو بے قرار ہوں۔ مگر بارہا تمہیں تنہا پا کر بھی کچھ کہہ نہ پایا کہ کہیں تمہیں میرے دل کی بات سن کر تمہاری فرشتوں جیسی پاکیزگی میں کسی قسم کی شکن نہ پیدا ہو جائے۔ ردا میں آج تمہیں یہ بات بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لینا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنی سادگی اور بھولپن سے مجھے تسخیر کر لیا ہے۔ تمہاری من موہنی صورت نے میرے قدموں کو اس طرح روک لیا ہے کہ بے اختیار دل یہ پکار اٹھا ہے کہ اب آگے جا کر کیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اگر مجھے پسند نہیں تو ناپسند بھی نہیں کرتی ہوگی۔ اور انشاء اللہ میرے دل کے آنگن کی طرح میرے گھر کے آنگن کو بھی آباد کرو گی۔'' ردا نے ایک اچٹتی سی نظر فاران پر ڈالی اور یہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی کہ ''فاران صاحب میرے دل کا نگر کسی کی تصویر سے آباد ہو چکا ہے۔ ردا میرے عزیز بھائی کا دل اپنے نازک قدموں سے روندتی ہوئی آگے جا چکی تھی اور فاران کے چہرے پر یاسیت اور شکست کی چھائی ہوئی بے پناہ سیاہی میرے دل کے اندر اتر گئی تھی اور میں کراہ اٹھا تھا۔ یہ سوچ کر کہ ردا کے اس جواب نے فاران کی روح کو جھلسا دیا ہوگا۔ فاران بوجھل

قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کے اندر چلا گیا اور میں اپنے بستر پر گر گیا۔ اس روز زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے سینے کے اندر ایک ناقابل بیان تکلیف کا احساس ہوا تھا۔ میرے دل کے اندر کوئی شے ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ مجھے شدید دکھ اس بات کا تھا کہ ردا فاران کے دل کی تپش کو محسوس نہ کر سکی تھی۔ میں نے اسی وقت اس فریم سے اپنی تصویر نکال کر اس میں فاران کی تصویر لگا دی جس کے نیچے ردا نے اپنے ہاتھوں سے وہ شعر لکھا تھا اور اپنی تصویر فاران کے خالی فریم میں لگا دی۔ یہ میرے دل کا فیصلہ تھا۔ قدرت نے میری شخصیت کو نامکمل بنا دیا تھا اور اب میں صرف ہمدردی کے سہارے کا مستحق تھا۔ محبت کا نہیں اور محبت کی آڑ میں ہمدردی اور بیساکھی کا سہارا مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔

دوسرے دن جب کائنات پر ابھی نوری بارش شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں اپنے بوجھل دماغ کو سکون پہنچانے کے لئے کچھ دور نکل گیا اور شام تک ایک باغ کے تنہا گوشے میں نظمیں لکھتا رہا۔ شام کے سایے جب گہرے ہونے لگے تو میں نے گھر جانے کا ارادہ کیا اور گھر پہنچا تو ایک روح فرسا حادثہ میرا منتظر تھا۔ ردا فاران کی تصویر کے نیچے سے وہ شعر کاٹ کر اس گھر سے جا چکی تھی اور اس کے جانے کے کچھ ہی دیر کے بعد میرے پیارے بھائی فاران نے خودکشی کر لی تھی۔ اور میرے ہاتھوں میں ردا کا وہ مختصر سا خط کانپ رہا تھا جو وہ میرے تکیہ کے نیچے چھوڑ گئی تھی۔

میں نے خود کے لئے کسی مضبوط بازو کے سہارے کی تمنا کبھی نہیں کی تھی۔ ہاں اس کے عوض مجھے کسی کی بیساکھی بننا زیادہ عزیز تھا کیونکہ میں تو بس اتنا ہی جانتی ہوں کہ خارزار راہوں سے گزرنا سچی الفتوں کی شان ہے۔ ریگ زاروں اور آگ کے دریاؤں کو پار کر جانا لازوال چاہتوں کی معراج ہے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو صرف جذباتی کھیل کھیلنا جانتی ہیں۔ اس کے باوجود دل پر ٹھکرائے جانے کا جو زخم لے کر جا رہی ہوں وہ مجھے تمام عمر تڑپاتا رہے گا۔ خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر چکا تھا۔ آہ! فاران، میں اگر خودکشی کر لیتا تو حق

بجانب تھا۔ یہ کون جانے کہ ہمدردی درد، محبت اور فرض کی اس جنگ میں ٹھوکر کس نے کھائی تھی۔ وقت ایک لمبی اڑان بھر چکا ہے۔ فاران کی خودکشی کے بعد شہنواز منزل پر نحوست کے سایے منڈلانے لگے۔ اس نحوست کی لپیٹ میں رفتہ رفتہ سب کچھ کھوتا چلا گیا۔ بڑے بھیا اور بھابھی اس صدمہ عظیم کو برداشت نہ کر سکے اور چھ ماہ کے اندر اندر اپنا ٹوٹا ہوا دل لے کر مالک حقیقی سے جا ملے۔ شمانہ شادی کے بعد سسرال گئی اور وہاں جا کر دائم المریض بن گئی اور پھر وقت کی رفتار نے آہستہ آہستہ شہنواز منزل کے عالی شان در و دیوار پر سے اپنے بے رحم پنجوں کے ذریعے اس کا ہر نقش مٹا ڈالا۔ میں ایک انتہائی ضعیف انسان بن کر اس کھنڈر سی حویلی میں ایک پیاسی روح کی طرح بھٹک رہا ہوں۔ تنہائی ہر وقت مجھ سے ایک سوال کرتی رہتی ہے۔ دنیا کی ہمدردی کا صحیح مستحق کون تھا۔ میرا احساس بھائی فاران جو محبت کی ناکامی کو برداشت نہ کر سکا اور موت کی آغوش میں پناہ لے لی۔ ردا جس نے محبت پر ہمدردی کو ترجیح دی اور اپنی دنیا خود بگاڑ لی۔ میں جو اس سلسلے کی ایک کڑی ہو کر سارا تماشہ خاموشی سے دیکھتا رہ گیا اور کچھ نہ کر سکا۔ اب میری برباد زندگی کی صرف چند سانسیں باقی رہ گئی ہیں۔ نہ جانے کب یہ تار نفس بھی ٹوٹ جائے اور کبھی کی یہ شہنواز منزل اپنی اس ہوش ربا داستان کے ساتھ میرا مدفن بن جائے۔ وہ خوبرو نوجوان فوجی افسر اس حویلی کو خریدنا چاہتا ہے۔ نئے وقت کے ساتھ اس کھنڈر نما حویلی پر ایک نئی عمارت کی بنیاد ڈالی جائے گی۔ زندگی سے بھرپور نئی داستانیں جنم لیں گی۔ اس سے پہلے کہ یہ حویلی میرا مدفن بن جائے میں اسے اس افسر کے سپرد کر دونگا تاکہ ان مردہ تمناؤں کی مزار پر ایک نئی اور جگمگاتی ہوئی یادگار قائم ہو سکے۔ میرے سفید بال آج اس کھنڈر میں گزرنے والی ان تمام ساعتوں کو سلام کر رہے ہیں۔ جن میں کبھی خوشیاں ملیں، کبھی پریشانیاں آئیں اور کبھی پھول نے اور کبھی کانٹوں نے لہولہان کیا۔

☆☆☆

میری تشنہ لبی

میں ابھی ابھی رعنا سے مل کر اپنے گھر واپس آئی ہوں اور بے چینی سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی ہوں، ذہن میں ایک انتشار برپا ہے، دل بار بار یہی سوچ رہا ہے کہ کیا انسانی زندگی کے المیے کا یہ ایک اہم پہلو نہیں ہے کہ ایک ہستی جو مونس وغم گسار اور شریک رنج وراحت کا لیبل لگا کر ایک دوسری ہستی کے حوالے کی جاتی ہے اور جس سے بجا طور پر یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ زندگی کی جدوجہد میں اس کی معاون بنے گی وہی اس کے لیے قدم قدم پر ایسی رکاوٹیں کھڑی کردے جن سے ٹھوکریں کھاتے کھاتے راہ حیات کا بدنصیب راہی اپنی منزل تک پہنچنے کی بجائے راستے کے گردوغبار میں گم ہو کر رہ جائے۔

اس سوال نے میرے ذہن پر گھٹن کی سی کیفیت طاری کردی ہے اور خیالوں کے کینوس پر معصوم رعنا کا چہرہ ابھر رہا ہے۔ ہاں یہ کل ہی کی تو بات ہے کہ بھولی بھالی رعنا کسی ابلتے چشمے کی طرح کھلکھلاتی مسکراتی ہر طرف رواں دواں تھی۔ اس کا پورا وجود ایک ترنم اور اس کی ساری ہستی ایک شعری کیفیت تھی۔ حصول تعلیم اس کا مقصد حیات اور نظمیں لکھنا اس کا پیارا مشغلہ تھا۔ وہ

پھولوں کی اس ڈالی کی طرح نازک تھی جس میں نسیم سحر کی ہواؤں سے بھی لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ حسن کا ایسا بے مثال پیکر تھی جس کے سامنے حوروں کا حسن بھی ماند پڑ جائے۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی سنگ تراش نے سنگ مرمر کا مجسمہ تراش کر اس میں جان ڈال دی ہو۔ بے مثال چہرہ سرمگیں آنکھیں بھرے بھرے نازک لب اور کالی گھٹاؤں کو شرما دینے والے سیاہ بال۔

رعنا مجھ سے عمر میں کافی چھوٹی تھی۔ اس کے باوجود ہمارے تعلقات دوستانہ تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنی لکھی ہوئی نظموں پر مجھ سے اصلاح لینے کے لیے آتی تھی۔ مجھے اس کی پیاری پیاری نظموں میں ایک کیف اور سرور کا احساس ملتا تھا۔ ان کے اندر ایک رومان پرور چاشنی، ہلکی ہلکی معنوی بیداری اور شدتِ احساس جمال تھا۔ ان نظموں کی رومان پرور چاشنی میں ڈوب کر ایک دن میں نے رعنا سے یہ سوال کیا تھا ”رعنا کیا تمہارا شریک حیات تمہاری ان نظموں کے معیار پر پورا اترے گا؟“ مجھ سے یہ سوال سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ ہنسنے کی وجہ سے اس کے موتیوں جیسے دانت بجلی کی طرح چمک پڑتے تھے۔ اس نے اپنی پتلی پتلی شمعی انگلیوں پر دوپٹے کا کونا لپیٹتے ہوئے جواب دیا تھا ”کیوں نہیں باجی وہ تو میری نظموں کی زندگی ہوگا۔ آپ دیکھیں گی اس کے کشادہ ماتھے پر سیاہ گھونگریالے بالوں کی لٹیں جھوم جھوم کر اس کے شاعر ہونے کا اعلان کریں گی اور اس کے ہنستے مسکراتے ہونٹوں پر کوئی حسین سی غزل مچلتی ہوگی۔ رعنا کے دل کا آبگینہ بہت ہی حساس اور نازک تھا۔ مگر اس کے برعکس اس کی امی کے نظریات صرف امیر و کبیر طبقے کی حمایت کرتے تھے۔ اس لیے وہ صرف یہی چاہتی تھیں کہ ان کی حسین بیٹی اطلس اور کمخواب کی چمک دمک میں گم ہو جائے۔ ایک امیر و کبیر داماد کا سہارا وہ اس لیے چاہتی تھیں کہ اس کے اثر و رسوخ کی بدولت ان کی رسائی بھی اونچے گھرانوں تک ہو سکے۔ اس سلسلے میں قدرت نے ان کا ساتھ دیا اور انہیں منہ مانگی مراد مل گئی۔

شہر کے ایک بہت بڑے رئیس صفدر نواب جن کی عمر پچپن سے بھی تجاوز کر چکی تھی اور

ان کی بیوی کا انتقال ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا، وہ بیوی کے انتقال کے بعد اپنے کاروبار میں اس قدر مصروف رہے تھے کہ انہیں اپنی عمر کے بھاگنے کا احساس ہی نہ رہا تھا اور جب اپنے کاروبار کو محنت سے آگے بڑھا کر وہ بے پناہ دولت کے مالک بن گئے تو اچانک ہی انہیں اپنی خالی زندگی کا احساس ستانے لگا، مگر اس درمیان تنہائی سے فائدہ اٹھا کر دولت نے اپنی برائیوں کی تمام جڑیں ان کی شخصیت کے اندر پیوست کر دی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ عمر کی اتنی منزلیں گزر جانے کے باوجود انہیں ایک ایسی نو بہار کلی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جسے بیوی کا لیبل لگا کر وہ اپنی خواب گاہ کی زینت بنا سکیں۔ چنانچہ ان کے چند قریبی دوستوں نے ریشم کی طرح ملائم اور پھول کی طرح معطر رعنا کا ذکر ان سے کر ڈالا۔ اس کی بے مثال خوبصورتی کا ذکر سن کر انہوں نے رعنا کے لیے اپنا پیغام روانہ کروا دیا۔ جس گھر میں جوان لڑکی ہوتی ہے اس گھر میں رشتوں کے پتھر تو آتے ہی رہتے ہیں، چنانچہ رعنا کے لیے جب صفدر نواب کا پتھر آیا تو اس کی اماں نے اسے پکڑ کر اس طرح چوم لیا جیسے وہ حجر اسود ہو۔ انہوں نے یہ کہہ کر اس رشتے کی منظوری دے دی کہ ''دولت کی عمر چاہے جتنی ہو وہ کم سن ہی رہتی ہے۔'' رعنا نے جب اپنی تقدیر کا یہ بھیانک فیصلہ سنا تو اس کے ہوش اڑ گئے اور اسے ایسا لگا کہ جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو یا کوئی بم آ گرا ہو۔ رات کی تنہائی میں اس کا دل اس سے کہتا کہ وہ اس فیصلے پر بغاوت کر دے اور اپنی مرضی کے شریک حیات کو حاصل کر کے کائنات کی رنگینیوں سے اپنے آنچل کو رنگ لے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ضمیر کی آواز بھی اس سے کہتی کہ وہ ایسا کر کے خاندانی شرافت اور وقار کو بدنامی کے غار میں نہ دھکیلے۔ اس کا دماغ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بالآخر ایک طویل کش مکش سے گزرنے کے بعد دل کی آواز پر ضمیر کی آواز غالب آ گئی۔ اس نے ضمیر کی آواز پر سر جھکا دیا اور والدین کی رضا کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لیا۔ قیامت کا وہ لمحہ آیا اور گزر گیا جس میں اسے فیصلہ کرنا تھا۔ لمحوں کے یہ فیصلے کبھی کبھی زندگی میں بہاروں کی طرح خوشیاں بکھیر دیتے ہیں اور کبھی زندگی بھر کے لیے لہولہان کر

دیتے ہیں۔ قطرہ قطرہ کر کے وہ لہو جو دل سے رستا ہے، روح میں جذب ہو جاتا ہے اور پلکوں پر موتی بن کر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ ٹوٹنا اور بکھرنا کیسا تکلیف دہ ہوتا ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔ ماں باپ اور بھائی بہنوں کے درمیان گھری ہوئی وہ چپکے چپکے روتی رہی۔ یہاں تک کہ روتے ہی روتے بارات کا دن بھی آ گیا اور اس دن وہ بالکل ہی خاموش ہو گئی، ایک دم گم سم۔ اس کے وجود میں رونے کی بھی طاقت باقی نہ رہی۔ امید کے تمام دیئے ایک ایک کر کے بجھ گئے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے حد نظر تک اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا اور اسے لگنے لگا کہ وہ تاریکی کے گھور اندھیارے میں ڈوب گئی ہے۔ مگر اس کے گھر میں چاروں طرف خوشی کے شادیانے گونج رہے تھے۔ حریری ملبوسات اور جگمگاتے زیوروں کا ہر طرف ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ وہ دلہن بنی سہیلیوں کے حلقے میں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ دلہن بن کر اس کا معصوم روپ اور بھی نکھر آیا تھا۔ باریک سی مانگ میں افشاں یوں چمک رہی تھی جیسے آسمان سے ستارے ٹوٹ کر ان میں آ ٹکے ہوں۔ اس کے گورے گورے ہاتھوں میں حنا کی خوشبو رچائی گئی تھی اور دولہا کی طرف سے لائے گئے قیمتی زیوروں میں اسے لاد دیا گیا تھا۔ مگر ان تمام باتوں سے بے نیاز اس کی گھنی پلکیں لرزیدہ تھیں اور خوبصورت گلابی گالوں پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ نکاح کے بعد اطلس اور کمخواب کے جوڑے میں لپٹی لپٹائی جب وہ رخصت ہونے لگی تو اس کی ممی نے اپنی پرنم آنکھوں کے ساتھ اسے کلیجے سے لپٹا کر کہا "بیٹی شادی کے بعد ہر لڑکی پرائی ہو جاتی ہے۔ اس کا جسم بلکہ اس کی روح تک اس کے شوہر کی امانت بن جاتی ہے۔ مجھے اس بات کا پورا بھروسہ ہے کہ تم جس اچھے گھر میں جا رہی ہو وہاں تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

آنسوؤں کی چھاؤں میں رعنا والدین کے معمولی گھر سے نکل کر ایک عالیشان محل میں منتقل ہو گئی۔ مگر عالیشان مکان میں دولت کی چھاؤں تلے اس کے سارے خواب ریت کے محل کی طرح بکھر گئے۔ پندرہ دنوں کے بعد مجھے خبر ملی کہ رعنا سسرال سے واپس آئی ہے۔ یہ سنتے ہی میں

اس سے ملنے کی غرض سے اس کے یہاں گئی۔ مگر رعنا کو دیکھتے ہی میرا کلیجہ جیسے دھک سے ہو کر رہ گیا۔ وہ حسین سنگ مرمر کا سراپا جو کبھی کسی حسین غزل سے مشابہ تھا وہ اب کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد نظر آرہا تھا۔ رعنا کے پژمردہ چہرے پر کسی نامعلوم یاسیت کے سایے تھے۔ اس کی وہ بڑی بڑی آنکھیں جو کسی جھیل کی طرح گہری تھی ان میں کسی ریگستان کی سی ویرانی سما چکی تھی اور وہ کسی مرجھائے اور مسلے ہوئے پھول کی مانند لگ رہی تھی۔ جو چمک دمک اس کے جسم کے زیورات اور کپڑوں میں تھی وہ اس کے چہرے پر نہ تھی، مگر اس کی ممی نے اس کا مرجھایا ہوا زرد چہرہ نہ دیکھا بلکہ زیوارت سے سجا سجایا جسم دیکھا اور مسرت سے سرشار ہو کر بول پڑیں "میری رانی بٹیا کو کسی کی نظر نہ لگے۔"

تنہائی میں رعنا نے مجھے بتایا کہ باجی میرے شوہر ایک دولت مند آدمی تو ضرور ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ شراب کے رسیا ہیں، ہوٹل کے دلدادہ ہیں اور اتنا ہی نہیں وہ بے انتہا عیاش اور بداخلاق بھی ہیں۔ مگر باجی مجھے تو ان کے ساتھ اپنی زندگی کاٹنی ہی پڑے گی کیونکہ اس کے سوائے میرے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں۔ آپ فکر نہ کریں باجی میری زندگی کے اس حسرت بھرے سفر میں میری یہ نظمیں میری شریک سفر رہیں گی۔ جب کبھی مجھے زندگی کی راہوں پر چلتے ہوئے شدید اندھیروں کا احساس ہونے لگے گا تو میں انہیں اس رہگزر پر روشنی کا نام دے کر پکارلوں گی۔ جب خزاں رسیدہ ہواؤں کے تھپیڑے مجھے آنسوؤں کی سوغات بخشیں گے میں انہیں بہار کا نام دے کر گنگنالوں گی۔ جب کبھی میری بڑھتی ہوئی مایوسیاں مجھ سے میرا عزم وحوصلہ چھین لینے کی کوشش کریں گی میں انہیں امید کہہ کر اپنے کلیجے سے لگالوں گی۔ جب کبھی مجھے شدت سے یہ احساس ستانے لگے گا کہ زندگی نے مجھے غم کے اتھاہ ساگر میں ڈبو دیا ہے۔ تو میں انہیں مسرت کا نام دے دوں گی۔ اس طرح یہ کانٹوں سے بھرا طویل سفر کاٹ ہی لوں گی۔

جب میں اپنے افسردہ دل کے ساتھ رعنا سے مل کر رخصت ہو رہی تھی تو اس کی امی کے

چہرے پر بے پناہ مسرت کی لکیریں تھیں۔اس وقت میرے دل کے اندر سے بے اختیار ایک آہ
نکل گئی تھی اور میں سوچنے لگی تھی ، ہائے رعنا تو ایک پھول کا نام تھا۔ پھر اس پھول کو کیوں مسل دیا
گیا۔ کیسے ہوتے ہیں وہ والدین جو اپنی بیٹی کو ناز و نعمت سے پروان تو چڑھاتے ہیں مگر اس کی
زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرتے وقت اس خیال کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب زندگی
اجڑتی ہے تو کیسا احساس ہوتا ہے۔ حساس، نازک دل میں جب نیزے کی انی چبھوئی جاتی ہے تو
کیا قیامت گزرتی ہے اور اپنی مرضی کے خلاف جب ایک ناپسندیدہ شریک حیات کے ساتھ
زندگی گزارنی پڑتی ہے تو یہ عذاب کیسا جان لیوا ہوتا ہے۔

☆☆☆

عہد رفتہ کے نشاں

جون کا مہینہ تھا اس لیے گرمی اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ آج صبح سے اس کی تپش حد سے سوا تھی۔ اس لیے سنسناتی ہوئی دوپہر کے آنے تک سورج کا چہرہ سرخ کے بجائے زرد ہو گیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کھلے ہوئے آسمان سے بے نقاب ہو کر آگ برسا رہا ہے۔ بڑے ڈھنڈار برآمدے کی زمین توے کی طرح دہک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا تو شاید اس منہ زور گرمی کے آگے سپر ڈال کر حویلی کے احاطے میں پھیلے ہوئے تناور درختوں کی پناہ میں چلی گئی تھی۔ اس وسیع و عریض حویلی کے چپے چپے میں اس وقت بس ایک طویل سناٹے کا راج تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پتے پتے کو گہری نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ طائر اپنے آشیانوں میں دبکے بیٹھے تھے اور ماحول پر ایک گہرا سکوت طاری تھا۔

گرم فضا کی اس حدت میں اچانک ہی چھوٹی دلہن پر پیاس کی شدت نے غلبہ کیا۔ ان کے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے تو وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھیں۔ سیلنگ فین کی مدھم سی گھن گھن جب ان کی سماعت سے ٹکرائی تو انھوں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ چھوٹے نواب بے ترتیبی

سے تکیہ دبائے ہوئے ایک طرف پڑے خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ چھوٹی دلہن کی نظر جب اپنے سراپا پر پڑی تو وہ خود بہ خود شرما گئی۔ ہلکے نارنجی رنگ کی باریک سوتی ساڑی پنڈلیوں سے اوپر تک کھسک گئی تھی اور گوری گوری ننگی پنڈلیوں پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں موتیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ صاف وشفاف گداز سینہ نصف سے زیادہ عریاں تھا۔صبح سویرے غسل سے فارغ ہوکر انھوں نے بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی تھی۔ لمبی لمبی الجھی ہوئی سیاہ لٹیں بل کھاتی ہوئی کسی ناگن کی طرح انکی نازک پتلی کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھیں۔اس جان لیوا تمازت سے بے چین ہوکر وہ کھڑی ہوگئیں۔ بکھرے ہوئے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر بڑا سا جوڑا خوب اوپر کر کے باندھا۔قیامت کی اس تپش میں وہ کمرے سے باہر نکلنا تو نہیں چاہتی تھیں مگر شدت کی پیاس اس وقت گرمی کی حدت پر غالب آگئی تھی۔خس کی ٹٹیوں کے نزدیک رکھی ہوئی صراحی کے ٹھنڈے پانی کی تراوٹ کے احساس نے انہیں اس بھری دوپہر میں کمرے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا اور وہ بڑی آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئیں۔

شبانہ اس پرشکوہ حویلی کی چھوٹی بہو بن کر تو آگئی تھیں لیکن انہیں اس حویلی کے اندر اس خطاب کا حق دار کبھی نہیں سمجھا گیا اس لیے کہ وہ کبھی اسٹیج پر رقص کرنے والی ایک نامور رقاصہ تھیں۔اپنے رقص کے لاجواب فن اور بے مثال ملکوتی حسن کے ساتھ جب وہ اسٹیج پر اترتیں تو تماش بین کی نگاہیں ان کے سراپا پر جیسے جم کر رہ جاتیں۔ شبانہ کو اسٹیج کی اس رنگا رنگ دنیا کی خواہش کبھی نہیں تھی۔ یہ صرف گردش حالات کا سفاک دھارا تھا جس کے رو میں ایک عرصہ تک بہتے بہتے وہ اسٹیج کی رقاصہ بن گئی تھیں۔ رقاصہ ہوتے ہوئے بھی ان کے دل کے گوشے میں پنہاں کسی شریف گھرانے کی بہو بننے کی تمنا کبھی مر نہ سکی۔وہ ان کے دل کے گوشے میں ان کے قدموں ہی کی طرح ہمہ وقت تڑپتی رہتی۔ان کے دل کی اس پیاسی تمنا نے انہیں ایک دن قصرِ شجاعت کی چھوٹی بہو بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسٹیج کی بدنام دنیا چھوڑنے کے بعد جب وہ اس عظیم الشان حویلی کی سب سے چھوٹی بہو بن کر آ گئیں تو یہاں ان کے ساتھ جو ٹکراؤ ہوا وہ دراصل دو حیثیتوں اور دو تہذیبوں کا ٹکراؤ تھا۔ گرچہ اب پرانا وقت نہیں رہا تھا پھر بھی اس حویلی کے مکیں پرانے نہیں تھے۔ بدلتے ہوئے وقت کے آہنی ہاتھوں نے بہت سی بلند حویلیوں کی شان و شوکت اور عظمت کو دیکھتے ہی دیکھتے منہدم کر کے تہہ نشیں کر دیا اور نہ جانے کتنے ہی ارکانِ دولت اور حشمت وقت کے سفاک اور تیز دھارے میں بہہ کر اس طرح گم ہو گئے کہ ان کی یادیں محض اوراق پارینہ بن گئیں اور ان اونچی اونچی حویلیوں میں رہنے والے رئیسوں کے نام و نشان تک ذہنوں سے محو ہو گئے لیکن قصر شجاعت کی بلند و بالا دیواروں پر ٹنگی ہوئی ان قد آدم تصاویر پر وقت کی گرداب تک نہ پڑنے پائی تھی جن کے مقدس ہاتھوں نے اس پر شکوہ عمارت کی بنیاد صرف عزت اور شرافت پر رکھی تھی۔ گرچہ پرانے وقت کا وہ شان و دبدبہ اب باقی نہیں رہا تھا، لیکن یہ عظیم الشان حویلی اس خاندانی عظمت اور وقار کی منہ بولتی تصویر تھی اور اس کی عظمت رفتہ کا ثبوت اس کی وہ بلند و بالا محرابیں، کنجیاں اور توشہ خانے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کی اچانک موت کے بعد ان کے چاروں بیٹوں نے بھی ماضی کی روایات کو برقرار رکھا مگر ان کی بھرپور کوششوں کے باوجود حویلی کے بہت سارے حصے شکستہ ہو گئے تھے۔ اتنی بڑی عمارت کو اب نئے سرے سے بنوانا تو ممکن نہیں تھا اس وجہ سے باقی ماندہ حصے بھی رفتہ رفتہ زمین بوس ہوتے جا رہے تھے۔ لہٰذا آبادی کے خیال سے ان لوگوں نے حویلی کا کچھ حصہ غریب اور نادار طالب علموں کو رہنے کے لیے دے دیا تھا جن سے کرایہ لینا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس دریا دلی کی وجہ سے یہ بے سہارا طالب عالم اس چوکھٹ کے گن گاتے تھے۔ یہ بے فکر نوجوان لڑکے اپنے علم کی پیاس بجھاتے بجھاتے جب کسی قابل ہو جاتے تو اس عظیم الشان خاندان کے احسان کے بوجھ کو اپنے ساتھ لے کر رخصت ہو جاتے۔

قیصر شجاعت کے تین بھائیوں نے اس حویلی کی گذشتہ خاندانی وقار کو مجروح ہونے

نہیں دیا اور اپنی شادیاں اپنے ہی فکر کے خاندانوں میں کیں۔ لیکن چھوٹے نواب امجد میاں اس روایت کو برقرار رکھنے میں بری طرح ناکام رہے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انسانی زندگی میں کبھی کبھی ایسے اچھوتے لمحے بھی چپکے سے قدم رکھ دیتے ہیں کہ ان کی آہٹ کا انسان کو احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ تو اس وقت چونکتا ہے جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان جانے درد نے اس کے دل میں اپنا گھر بنالیا ہے۔ وقت کی دین کا یہی ایک کمزور سا لمحہ تھا جس کے آگے ایک دن چھوٹے نواب جیسا دبنگ انسان بھی جھک گیا۔ امجد میاں ایک بار شہر کی سب سے نامور رقاصہ کا رقص دیکھنے کے لئے گئے تو وہ نازک بدن گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والی شبانہ جس کا شباب قیامت سے کم نہ تھا وہ اس کے حنائی قدموں کی تھرکتی ہوئی چال پر ایسا فدا ہوئے کہ اپنے خاندانی وقار کی پرانی صدیوں کی روایت پسندی کو چشم زدن میں ان کے قدموں تلے ڈال دیا اور اس عظیم گھرانے کا جگمگاتا ہوا بیش بہا تاج لمحہ بھر میں ہی ایک رقاصہ کے سر کی زینت بن گیا۔ اس قیامت کے گزرنے کے بعد اس حویلی میں ایک ایسا طوفان آیا کہ اس کی مضبوط بنیاد بھی لرز اٹھی۔ بڑے بھائیوں کی شیر کی طرح گرجدار آوازوں سے ایوان شجاعت کی دیواریں کانپ رہی تھیں مگر چھوٹے نواب ایک عزم کے ساتھ شبانہ کا نازک سا ہاتھ پکڑے ہوئے سر جھکا کر برف کی ایک ٹھنڈی چٹان کی طرح یہ سب کچھ بڑی ہی آسانی سے جھیل گئے۔ اس طرح شبانہ نے اسٹیج کی دنیا کو ہمیشہ کے لیے اپنے قدموں سے ٹھوکر ماردی۔ لیکن اس معتبر خاندان میں انہیں وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جس کی اب وہ مستحق بن چکی تھیں۔ یہاں انہیں چھوٹی دلہن یا چھوٹی بہو کے خطاب کا حقدار نہیں سمجھا گیا۔ اس بڑے گھرانے میں رہنے لیے انھیں تیز نگاہوں کے نشتر اور کڑوی کسیلی باتوں کے زہر اپنی روح کی گہرائیوں میں اتارنے پڑے۔ بڑوں نے تو انھیں ناچنے والی کے خطاب سے نوازا ہی تھا۔ سب بھائیوں سے چھوٹی کنواری بہن روحی نے بھی انھیں کبھی بھابھی کہنا گوارا نہیں کیا۔ روحی کی عمر شباب کی منزل سے تجاوز کرچکی تھی مگر وہ اب تک محض اس لیے کنواری

تھی کہ اسے ہم پلہ گھرانہ نہیں مل رہا تھا۔ جس وقت روحی انھیں کمینی، رذیل اور طوائف جیسے گھٹیا الفاظ کہتی تو ان کا دل لہولہو ہو جاتا اور لگتا کہ ساری دنیا آنسوؤں میں ڈوب گئی ہے۔ گھر میں بھی لوگ روزانہ ڈنکے کی چوٹ پر ان کی آبرو کی دھجیاں اڑاتے رہتے اور کوئی کبھی یہ سوچنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ وہ اب اس گھر کی عزت بن چکی ہیں۔ چھوٹے نواب کی منکوحہ۔ وہ ہر لمحہ، ہر گھڑی اپنے متعلق غلیظ اور مکروہ الفاظ برسر عام سنا کرتیں۔ صدمے اور ذلت کے احساس سے وہ روزانہ اندر ہی اندر چور ہوتی رہیں مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتیں۔ گھر کے چھوٹے بڑے افراد انہیں اسی تیز نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے کہ جیسے وہ کوئی نجس ترین جانور ہوں۔ پھر بھی وہ صرف اس ایک خیال سے مطمئن تھیں کہ اب وہ ایک عزت دار گھرانے کی فرد بن گئی تھیں۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے اس دہلیز کا ہر ظلم، ہر ذلت، زہریلے جملے اور گھناؤنے فقرے کمال ضبط اور صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرلیا۔ ایک عزت مآب زندگی گزارنے کے لالچ میں انھوں نے تمام تلخ رویوں کے گھونٹ شہد کی طرح شیریں سمجھ کر حلق سے نیچے اتارلیا۔ وہ اس خاندان کے جاہ و جمال اور رکھ رکھاؤ سے بہت مرعوب تھیں اور خود کو اس باوقار ماحول کے اہل نہ سمجھ کر انھیں صاف ستھرے بے داغ خاندان کے دامن پر اپنے وجود کو ایک بدنما داغ تصور کرتی تھیں۔ انھوں نے گھر کے ہر چھوٹے بڑے فرد کے جذبات کا خندہ پیشانی سے احترام کرنا اپنا فرض سمجھا اور رفتہ رفتہ اپنے حسن سلوک اور کردار کی عظمت سے چھوٹے نواب کے دل میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ بنالیا جہاں سے انہیں کوئی ہٹا نہیں سکتا تھا۔

آج دوپہر کی شدید گرمی نے چھوٹی دلہن کو پیاس سے بدحال کردیا تھا اور وہ بیتاب ہو کر برآمدے میں رکھی ہوئی صراحی کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہی تھیں کہ اپنی پشت پر ایک مدھم سی آواز سن کر وہ چونک پڑیں۔ دفعتاً انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو طالب علموں کے ایک کمرے سے نکل کر تیزی سے بھاگتی ہوئی روحی پر ان کی حیرت زدہ نگاہیں جیسے جم کر رہ گئیں۔ اپنی پھٹی پھٹی

نظروں سے شباب کی منزل کو عبور کر جانے والی روحی کے سراپا پر جب انہوں نے غور کیا تو فوراً ہی معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئیں۔ کمرے سے نکل کر تیزی سے بھاگنے کی وجہ سے روحی کا دوپٹہ زمین پر گر گیا اور اس کے پیروں میں الجھ گیا اور شبانہ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح بوکھلا کر بکھرے بکھرے حلیہ کے ساتھ دھڑام سے ان کے قدموں کے قریب زمین پر گر گئی۔ یہ دیکھ کر شبانہ کے ہونٹوں پر ایک زہر خند اور پر اسرار سی مسکراہٹ ابھری۔ انھوں نے سہارا دے کر روحی کو اٹھایا اور زمین پر پڑا ہوا دوپٹہ اس کے سر پر ڈالتے ہوئے نہایت پرسکون لہجے میں اس سے مخاطب ہوئیں ''بی بی اس طرح دوڑ کر چلنے سے نازک نازک پیروں میں موچ آ جاتی ہے۔ ہاں ہم ناچنے والیوں کا کیا ہے؟ ہمیں تو بھاگ دوڑ کی عادت ہوا کرتی ہے۔ لیکن شریف اور اونچے خاندان کی لڑکیاں اس طرح غیر لڑکوں کے کمرے سے نکل کر نہیں بھاگا کرتیں۔'' پھر انہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ صراحی کے ٹھنڈے پانی سے اپنی پیاس بجھائی۔ پیاس کے بجھتے ہی انھیں یہ احساس بھی ہوا کہ اب ان کے دل کے اندر چھپی وہ پیاس بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ گئی ہے جو اکثر روحی سے چھوٹی بھابی کہلوانے کے لئے اٹھا کرتی تھی۔

☆☆☆

اپنی دیوار اپنا سایہ

آسمان کی رنگت اس وقت بالکل تانبے کی طرح ہو رہی تھی۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ زمین کا سینہ جلا رہی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی اور جلتی تپتی ہوئی سڑک کے کنارے درختوں جھاڑیوں کی خشکی گرمی کی شدت کا اظہار کر رہی تھی۔ خاک اور دھول ہر شے کا چہرہ ڈھانپ چکی تھی۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ ایسے وقت میں ثاقب اپنے تھکے ہوئے ذہن اور ٹوٹے ہوئے جسم کے ساتھ اپنے گھر کی سمت بڑھ رہا تھا۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور محنت کے بعد آج پھر اس کے حصے میں ناکامیوں کی سوغات آئی تھی۔ ناکامی کا شدید احساس اور اپنے گھر کی گھٹن کا خیال کر کے اس کے دل و دماغ کو ایک جھٹکا سا لگ رہا تھا اور وہ بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے گھر کا راستہ طے کر رہا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اور اس کا دماغ سوچ و فکر سے پریشان تھا۔ اس کا دل اس احساس سے لہو لہان ہو رہا تھا کہ آہستہ آہستہ رینگنے والے وقت نے میری زندگی کے تیس سال اپنی جھولی میں سمیٹ لئے مگر کسی کو کیا پتہ کہ عمر کی یہ مسافتیں طے کرنے کے دوران مجھے کتنی پرخار راہوں سے گزرنا پڑا ہے، دکھوں کے کیسے کیسے سائے مجھ پر چھائے ہیں۔

مفلسی اور غربت کا سایہ جب کسی انسان کے وجود سے لپٹا ہوتا ہے تو ایک دردناک کہانی جنم لیتی ہے جو آنسو بن کر اس انسان کی آنکھوں سے ٹپکنے لگتی ہے۔ ایسی ہی ایک کہانی ثاقب کی زندگی بھی تھی۔ حرماں نصیبی اور مفلوک الحالی کا پیرہن پہنا کر قدرت نے اسے زندگی کی تمام نعمتوں سے محروم کر دیا تھا۔ محرومی کے اس احساس نے اسے نہ جانے کتنے آنسوؤں کی سوغات سے نوازا تھا۔ اس کی بدقسمتی کی داستان اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی جب اس کا وجود اس دنیا میں آیا تھا کیوں کہ اس کے والد نے اس کے دنیا میں آنے کے چند روز بعد ہی اس دنیا سے اپنا ناطہ توڑ دیا۔ بیوہ ماں نے اس کی چچی کے رحم و کرم پر رہتے ہوئے وقت اور حالات کا مقابلہ کر کے اسے پروان چڑھایا تھا۔ خزاں رسیدہ ہواؤں کے درمیان جوانی کی بہاروں نے اس کے دل پر دستک دی تھی۔ شباب کی راہیں جب انسان کے قدم چومنے لگتی ہیں تو وہ حالات کے گرد و پیش نہیں دیکھتی ہیں۔ وہ تو بس چپکے سے دل کے اندر اپنے ارمانوں کی دنیا بسا لیتی ہیں۔ جوانی کی انہی رنگین بہاروں کے درمیان فارینہ نسیم سحر کے نرم و لطیف جھونکوں کی طرح اس کے دل کے تاروں کو چھیڑنے لگی اور اپنے پاکیزہ اخلاق و کردار کے ساتھ شباب کی رعنائیاں لئے عروس نو بہار بن کر اس کی زندگی پر چھا گئی۔ وہ باد صبا کا ایک رنگین جھونکا تھی جو اس کے دل کے آنگن میں اتر آئی تھی۔ اس کی نرم و نازک اور بھولی بھالی سی شخصیت میں فطرت نے اپنے حسن کے سارے خزانے یکجا کر دیئے تھے۔ اس کی گہری گہری ستاروں کی طرح جگمگاتی ہوئی آنکھیں ثاقب کو مدہوش کر دیا کرتی تھیں۔ مسکراتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر شوخ تبسم کی دنیا سجائے جب وہ اس کے قریب ہوتی تو وہ لمحہ بھر کے لئے سب کچھ بھول کر اس کی معصوم محبت میں کھو سا جاتا۔ اس کی معصوم سی ہستی ثاقب کی تلخ زندگی میں ایک مدھم چاشنی بن کر ڈھل گئی تھی۔ وہ اس حقیقت کو قطعی بھول گیا تھا کہ غربت کی تپش سے اٹھنے والی دھوئیں کی نحیف سی لکیر کو امیر کی آنکھیں ہمیشہ ہی اندھیروں کی چھاؤں میں دھکیل دیتی ہیں کیونکہ غربت اور افلاس کی گود سے اٹھتا ہوا، لرزتا ہوا

دھواں اپنے دامن میں کبھی روشن اجالے سمیٹ نہیں سکتا۔ لیکن انسان کے بھولنے سے حقیقت تو بدل نہیں سکتی۔ وہ اپنی جگہ اٹل رہتی ہے۔ چنانچہ ثاقب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور ایک دن دولت اور ثروت کی ایک ایسی آہنی دیوار اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی جسے مفلس کے کمزور بازو کبھی گرا نہیں سکتے۔ وہ اس کی زندگی کا سب سے بھیانک ترین دن تھا جب اس کی پاکیزہ محبت مجروح کر دی گئی۔ ایک دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ یا آیا اور اس کی ارمانوں کی دنیا کو سرخ جوڑے میں لپیٹ کر اپنی محل نما کوٹھی میں لے گیا۔ ثاقب اپنی جگہ تڑپ کر رہ گیا۔ فارینہ اپنی جگہ روتی بلکتی رہ گئی۔ نہ ہی وہ کچھ کر سکا اور نہ ہی فارینہ کچھ کر سکی۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں ہی طرف آگ پوری شدت کے ساتھ بھڑکی تھی۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد ان بھڑکتے ہوئے شعلوں نے چنگاری کا روپ لے لیا اور کچھ دنوں کے بعد چنگاریاں بھی راکھ بن گئیں اور پھر ہواؤں نے اپنے دوش پھیلا کر اس راکھ کو بھی منتشر کر دیا۔ یاسر فارینہ کا مقدر بن گیا اور فارینہ یاسر کی بیوی بن کر اپنی گرہستی کی دنیا میں کھو گئی۔

وقت کا دھارا حسب دستور بہتا رہا۔ ثاقب کی بوڑھی ماں چراغ سحری ہو رہی تھی اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا گھر میں کوئی نہ تھا کیوں کہ اس کی زندگی کا واحد سہارا تو صرف ثاقب تھا جو اپنا ٹوٹا ہوا دل لے کر غم روزگار کو گلے سے لگائے ہوئے نوکری کی تلاش میں تمام دن در بدر بھٹکتا رہتا تھا۔ چنانچہ ایک دن ماں کی آخری خواہش پر ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی ندا اس کی دلہن بنا دی گئی۔ وقت اور حالات کا ستایا ہوا ثاقب ندا کی شخصیت میں فارینہ کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ مگر ندا غربت اور افلاس کی بنیاد پر بنائے گئے اپنے چھوٹے سے گھروندے کو دیکھ کر جلتی کڑھتی رہتی اور ہمیشہ ثاقب کی طرف سے ایک کھچی ہوئی کمان بنی رہتی اور اس کے لبوں پر سدا ایک ہی شکوہ رہتا کہ اس کی تباہی و بربادی کے نقوش ایک تپتی ہوئی رہگزر کی نذر کر کے اس کے والدین خود سکھ کی نیند سو رہے ہیں اور وہ اپنی حسرتوں کا لٹا ہوا جنازہ لئے اس افلاس زدہ گھر کے اندر جی رہی

ہے۔ ثاقب ندا کی زبان سے یہ سب کچھ سنتا اور دکھوں کے الاؤ میں خاموش سلگتا رہتا۔ کبھی کبھی خود اس کا اپنا ضمیر بھی اسے ملامت کرنے لگتا کہ اس ظلم اور بربریت کی مرتب کی ہوئی داستان میں وہ خود بھی شامل ہے۔ گھر کا یہ جلتا ہوا ماحول اور اپنی اندرونی گھٹن کبھی اسے اتنا پریشان کر دیتی کہ اس کی اذیت سے کچھ دیر کے لئے چھٹکارہ پانے کی خاطر وہ فارینہ سے ملنے کے لئے اس کے گھر چلا جاتا اور اس کے دیدار کی خوشبو چپکے سے اپنے دل کے اندر سمیٹ کر چند ساعتوں کے لئے جینے کی راہ ڈھونڈ لیتا۔ مگر وقتی سہارے سے انسانی زندگی کے مسئلوں کی راہیں نہیں نکلتیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے تو روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے پاس پھوٹی کوڑی کی شکل میں بھی نہ تھا۔ وہ صبح کا گیا رات تک سرکاری دفاتر کی خاک چھانتا اور گھر آ کر بدحواس سا پڑ جاتا۔ گھریلو تلخیاں تھیں کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں اور ندا کی بدکلامی نے اس کا جینا حرام کر کے رکھ دیا تھا۔

شب و روز کی پریشانیاں اس کی صحت پر اثر انداز ہو رہی تھیں کہ اس پر اشفاق کی پیدائش نے اس کے لئے مزید پریشانیاں کھڑی کر دیں۔

آج بھی ثاقب دن بھر کے بعد اپنی ناکامیوں کا پروانہ لئے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوا۔ ماں کی طبیعت ان دنوں کچھ زیادہ ہی خراب ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ برآمدے کی چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ پاس ہی ندا بیٹھی اشفاق کی پھٹی ہوئی شرٹ کی مرمت کر رہی تھی۔ ننھا اشفاق اس کے قدموں کے پاس زمین پر بیٹھا ہوا کسی ٹوٹے کھلونے سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ حسب معمول ثاقب پر نظر پڑتے ہی ندا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے جسے نظر انداز کر کے وہ ماں کے سرہانے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ماں کے سینے پر بلغم کا دباؤ بڑھ جانے کی وجہ سے اس کی آواز میں کچھ لڑکھڑاہٹ سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے سہارا دے کر ماں کی کروٹ بدلی۔ ماں نے آنکھیں کھول کر اس کے پژمردہ چہرے کی طرف دیکھا اور دوا کے متعلق پوچھنے پر اس کے دل

کے اندر جو ہوک اٹھی اسے ماں کی ممتا نے فوراً ہی بھانپ لیا اور اپنی تکلیف کو اندر ہی اندر دباتے ہوئے اس نے بناوٹی مسکراہٹ سے کہا :

''بیٹا اب تو پہلے سے بہت آرام ہے۔''

مگر ثاقب کا دل ماں کی اندرونی اذیت کے خیال کے بوجھ تلے دب کر پھڑ پھڑانے لگا۔ ابھی وہ ماں سے کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ دفعتاً اس کے کانوں میں اشفاق کے رونے کی تیز آواز پڑی جسے ندا نے ایک زوردار طمانچہ لگا کر ہٹا دیا تھا اور بڑبڑا رہی تھی، شرارت کے مارے جینا مشکل کر دیا ہے کمبخت نے۔ ثاقب نے آگے بڑھ کر اشفاق کو گود میں اٹھا لیا اور دھیرے سے کہا ''اسے لاوارثوں کی طرح چھوڑ دوگی تو یہ شرارتیں نہیں کرے گا؟'' اتنا سنتے ہی ندا نے تیوری چڑھا کر کہا ''کیوں نہیں تم ہی اس کی دیکھ بھال کر لیتے ہو؟ صرف پیدا ہی کرنے کا شوق تھا؟ ثاقب کی اندرونی تمام پریشانیاں دفعتاً ہی قوت عمل میں تبدیل ہو گئیں۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور قینچی کی طرح زبان چلاتی ہوئی ندا کے گالوں پر پانچ انگلیوں کا نشان بن گیا۔ وہ روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

اس صورت حال کے لئے وہ اندرونی طور پر بالکل تیار نہیں تھا۔ چنانچہ کراہتی ہوئی ماں تڑپتے ہوئے اشفاق کو چھوڑ کر وہ الٹے قدموں سے باہر نکل گیا۔ اس کا ذہن مکدر تھا، دماغ کے اندر سنسناہٹ تھی۔ کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں اور دل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جانے پر آمادہ تھا لیکن کہاں؟ اپنے دل سے یہ سوال کرتا بے مقصد سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ بھٹکتے بھٹکتے جب شام کے سائے پھیلنے لگے تو وہ ایک سنسان کنج کے گوشے میں جا بیٹھا جہاں اس کی نگاہوں کے سامنے فارینہ کا مسکراتا پیکر ابھرنے لگا اور اس کا ذہن اپنی ازدواجی زندگی سے فارینہ کی ازدواجی زندگی کا موازنہ کرنے لگا۔ اس کا اپنا گھریلو ماحول کتنا گھٹن سے بھرا ہوا تھا۔ دوسری طرف فارینہ کی زندگی کتنی خوبصورت تھی۔ کتنا کشادہ ماحول تھا اس کے گھر کا۔ یہ خیال آتے ہی

اس کے قدم غیر ارادی طور پر فارینہ کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تک اس کی سکھی زندگی کے ماحول میں رہ کر اپنے گھر کی ہولناکی کو فراموش کرنا چاہتا تھا۔

جب وہ فارینہ کے گھر پہنچا تو وہ دونوں باہر دالان میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ثاقب کو دیکھ کر ان لوگوں کے چہرے مسرت سے کھل گئے اور انہوں نے بڑی ہی خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا۔ کچھ دیر میں فارینہ اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر لے آئی۔ مگر ثاقب کو آج نہ جانے کیوں فارینہ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی کافی بہت ہی تلخ سی لگی۔ وہ اس سے باتوں میں مصروف تھا اور بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے بیٹے اشفاق کی پھٹی ہوئی شرٹ اور ندا کے چہرے پر اس کی انگلیوں کے نشانات گردش کر رہے تھے۔ ان لمحوں کے درمیان اس نے کافی کی پیالی خالی کر دی۔ اس وقت تک اس کے دل کے اندر چلنے والا طوفان کچھ تھم گیا تھا۔ وہ فارینہ سے رخصت ہونے کے بعد اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستہ طے کرتے وقت اسے خیال آرہا تھا ندا کی محرومی کا جو اس نے اسے دے رکھی تھی۔ جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا اور ہلکی سی دستک دی تو معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے چٹخنی چڑھا دی اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ کمرے کے اندر دو چوکیوں کو جوڑ کر ایک بڑا تخت بنا دیا گیا تھا۔ جس پر وہ ندا اور اشفاق ایک ساتھ سویا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اشفاق تخت پر بے خبر سو رہا تھا۔ مگر ندا کی جگہ خالی پڑی تھی۔ اس نے برآمدے میں جھانک کر دیکھا تو ماں کی پائتی سکڑی سمٹی ندا سو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر ندا کو سوتی سمجھ کر کھڑا ہوا دیکھتا رہا مگر ندا کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔ وہ تو آنکھیں بند کئے خاموش نہ جانے کتنی دیر سے سوچ رہی تھی۔ کاش کبھی میرا شوہر یہ جاننے کی کوشش بھی کرتا کہ میرا بھی کوئی وجود ہے، میری بھی کچھ تمنائیں ہیں۔ مجھے ان سے لڑنے کا کوئی شوق نہیں، نہ جانے کیوں ان سے لڑ جھگڑ کر تو میری روح اور بھی بے قرار ہو جاتی ہے۔ یہ کون سی تشنگی ہے جو میرے اس فعل سے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان سے لڑ کر میری ہستی کی پیاس

کیوں نہیں بجھی؟ اپنے مجازی خدا کو ناراض کر کے مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔ اگر میں ہنسنا چاہتی ہوں تو اپنی ہر آواز سے چونک پڑتی ہوں۔ شاید انہیں ناراض کر کے ان کی مجبوریوں کو نہ سمجھ کر میں ایک بھیانک گناہ کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ اپنے اس اقدام کی وجہ سے میں اس لذت سے بھی آشنا نہ ہو پاؤں گی جسے ازدواجی زندگی کا گھر کہا جاتا ہے۔ کیا یہ سکھ صرف دولت اور پیسے سے خریدا جا سکتا ہے۔ نہیں نہیں اس کی بنیاد تو ایک دوست کے تئیں قربانی اور ایثار کے جذبے پر مبنی ہے۔ شاید مجھ میں اس جذبے کی کمی ہے۔ آخر مجھ میں یہ کمی کیوں ہے؟ یہ گھر اب میرا ہے، یہ نحیف اور بیمار ماں ننھا اشفاق اور وہ خود یہ سبھی میرے اپنے ہیں۔ یہ سب میری توجہ کے محتاج ہیں۔ میں ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال کر کے ان کی بے رنگ زندگی میں مسرتوں کے رنگ بھر سکتی ہوں۔ ان خوشیوں کے لئے پیسے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پیار محبت اور صادق جذبے کی۔ پھر میں اپنی قربانیوں سے، سچی لگن سے ان کے دکھ کیوں نہیں بانٹ سکتی۔ ندا کی پلکوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ ٹوٹ کر ماں کے قدموں کو بھگو رہے تھے اور دوسری طرف ثاقب ندا کے ان پاکیزہ جذبات اور احساسات سے بے خبر اپنے تنہا بستر پر خاموش بیٹھا سلگ رہا تھا۔ سامنے میز پر اس کا کھانا رکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی پانی کا گلاس بھی۔ مگر اس کی بھوک مر چکی تھی۔ کھانا تو اس نے جوں کا توں نعمت خانے کے اندر رکھ دیا اور بتی بجھا کر لیٹ گیا۔............ اس اذیت ناک سناٹے میں وہ اپنے ماحول کی تلخی سے فرار حاصل کرنے کے لئے سوچے چلا جا رہا تھا لیکن کوئی سرا اسے ایسا نہیں مل رہا تھا جس سے وہ ندا میں فارینہ کو پا سکتا۔ سوچتے سوچتے اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ تب ہی وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس وقت اسے سکون کی ضرورت تھی۔ ایک ایسے سکون کی جو اسے کسی کی قربت سے حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ بغیر لائٹ جلائے آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ماں کے پلنگ کے قریب گیا۔ پائیتی سکڑی سمٹی ہوئی ندا کو دیکھ کر بے اختیار اس کا دل بھر آیا۔ یہ میری زندگی کی ساجھے دار ہے، میرے گھر کی

زینت ہے۔ اسے خوشیاں دینا، اس کے دکھ سکھ کا خیال رکھنا میرا فرض ہے مگر آج تک اسے میری ذات سے کیا ملا؟ اچانک وہ جھکا اور اس کی انگلیاں ندا کے بالوں سے الجھ گئیں۔ ندا نے آنکھیں کھولیں اور اپنے سامنے ڈھانچہ سے کھڑے اجڑے اجڑے بے حد سوگوار ثاقب کو دیکھا۔ اس کی بھیگی پلکیں پشیمانی سے جھک گئیں۔ وہ ساس کی پائتیں سے اٹھ کر ثاقب کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی آئی۔ ایک نئے عزم و ارادے کے ساتھ۔ اس رات ان لوگوں نے مل کر چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی بنیادوں پر اپنا ایک نیا آشیانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ ایک ایسا آشیانہ جس میں دولت کی آرائش تو نہ ہوگی مگر وہ پیار و محبت کی گل کاری سے آراستہ ہوگا۔ اس رات ثاقب کا پورا وجود جس خوشبو سے معطر ہوا تھا وہ پرائی نہیں اس کی اپنی تھی۔ یہ اس کے اپنے گھر کی دیوار کا سایہ تھا جسے کسی دولت اور حشمت کی چھاؤں چھین نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

میرا گھر کہاں ہے

کائنات عالم پر رات کی سیاہی کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ ماحول پر ایک سکون مطلق طاری تھا اور فضا پر ایک عجیب سی خاموشی مسلط تھی۔ نہ کوئی صدا نہ کوئی اثر حیات۔ ایک غیر محدود تنہائی اور سکونِ محشر ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے تمام کائنات ایک کروٹ لینے کی خواہش مند ہے۔

اس بیکراں سناٹے کے عالم میں لکھنؤ شہر کے ایک چھوٹے سے کمرے کے اندر شیبا کا بدشکل شرابی شوہر وسیم اپنے بستر پر اوندھا سیدھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب کی خالی بوتل تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس کی بیوی شیبا کا وہ خط پھڑ پھڑا رہا تھا جو آج ہی صبح کی ڈاک سے اسے ملا تھا۔ شیبا نے اس خط میں اسے لکھا تھا۔

وسیم - زندگی کی کلفتیں اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ دل ہر وقت یہی چاہتا ہے کہ کیوں نہ مر ہی جاؤں۔ تم سے الگ ہونے کے بعد میں ایک لمحے کو بھی سکون کی سانس نہیں لے سکی ہوں۔ رہ رہ کر دل کے اندر کانٹے سے چبھتے رہتے ہیں۔ دل کی دکھن کی وجہ سے آنکھیں اتنے

آنسو برسا چکی ہیں کہ ایسا لگتا ہے جیسے ساری کائنات دکھ کے ان آنسوؤں میں ڈوب کر رہ جائے گی۔ اب میں زندگی کے اُس دوراہے پر آ کھڑی ہوئی ہوں جہاں جینے کی تمنا نہیں کی جاسکتی۔ صرف موت کی آرزو کی جاسکتی ہے۔ مگر میں تو موت کی دعا مانگتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ کیونکہ اشہر کی شکل میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ اتنی ننھی سی عمر ماں کی محبت سے محروم ہونے کی نہیں ہوتی۔ اگر میں اس معصوم کے لئے جینے کی آرزو کرتی ہوں تو مجھے وہ آگ نظر آنے لگتی ہے جو میرے سینے کے اندر ہی اندر سلگ رہی ہے اور میرے وجود کو رفتہ رفتہ بھسم کر رہی ہے۔

اس لئے چلے آؤ وسیم مجھ تک چلے آؤ۔ تمہارے بغیر میں اکیلی ہوگئی ہوں۔ بالکل تنہا۔ میرا نازک سا دل اتنے سارے غموں کا بوجھ اکیلے نہیں سنبھال سکے گا۔ آخر میں اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کے دیپ جلائے کب تک تمہاری راہ دیکھتی رہوں؟ کیا میں یہ سمجھ جاؤں کہ چاہے میرے ساہ بالوں میں چاندی کے تار جگمگا جائیں اور میرا جوان جسم ہڈیوں کے پنجر میں تبدیل ہوجائے تب بھی تم مجھ تک نہ آؤ گے۔ نہیں وسیم میرا دل بار بار آواز دے رہا ہے کہ تم آؤ گے اور ضرور آؤ گے۔ جس دن تم آؤ گے اس دن میری تمام آرزوئیں گنگناتی مسکراتی آئیں گی۔ اور میرے ہونٹوں سے لپٹ کر کے اٹھیں گی۔ میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرا ہم سفر میرے ساتھ ہے۔

تمہاری شیبا - خط پڑھ کر وسیم کے کریہہ ہونٹوں سے ایک بڑبڑاہٹ ابھری۔

''اتنی تکلیفیں ہیں تو خودکشی کیوں نہیں کر لیتی۔ مرنے والے کہا نہیں کرتے۔'' اتنا کہہ کر اس نے خط کو پرزے پرزے کیا اور ہوا میں منتشر کر دیا۔ اس کے بعد وہ سر سے پاؤں تک چادر تان کر سو گیا اور پھر کچھ ہی دیر میں اس کے بے پناہ خراٹے کمرے کی خاموش فضا میں گونجنے لگے۔

وسیم کو خط پوسٹ کرنے کے ایک ہفتے بعد شیبا اپنے میکے میں باورچی خانے کے اندر گم سم سی چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ وسیم کو خط لکھے ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر اس نے نہ خط کا جواب دیا اور نہ خود ہی آیا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اور خیالات کا ایک لامتناہی دھارا

اس کے بھٹکے ہوئے ذہن کو ادھر سے ادھر بہائے لئے چلا جا رہا تھا۔ ان سوچوں کے درمیان اس کی کھوئی کھوئی سی سوگوار نگاہیں چولہے سے گرتی ہوئی راکھ کی چنگاریوں پر ٹکی تھیں۔ نہ جانے وہ کب تک اسی طرح بت بنی رہتی کہ اچانک ہی ماں کی گرجدار آواز سے اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے اپنی اشک آلود نگاہیں اوپر اٹھائیں تو دیکھا کہ اس کی ماں کی آنکھوں سے قہر و غضب کے شعلے ابل رہے ہیں۔ اور وہ اس سے کہہ رہی ہے۔

اری او مردار .... اب بھی تو کچھ ہوش کی دوا کر۔ نہ جانے تیرے حواس کب ٹھکانے لگیں گے۔ چولہے کے پاس بیٹھ تو جاتی ہے مگر اس کی کوئی خبر نہیں رکھتی۔ دودھ ابل ابل کر کب کا نیچے گر رہا ہے اور تو نہ جانے کون سے سپنوں کی دنیا میں کھوگئی ہے۔ شیبا ماں کی کڑوی کسیلی باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکی اور خاموشی سے اپنی گردن نیچے جھکالی اور جب وہ اس پر گرج برس کر بہو کے کمرے کی طرف چلی گئیں تو شیبا سوچنے لگی۔

یہ وہی اماں تو ہیں جنہوں نے مجھے نو ماہ اپنی کوکھ میں رکھا ہوگا، موت اور حیات کے درمیان گھر کر مجھے جنم دیا ہوگا۔ اور پھر مجھے پروان چڑھانے کے دوران نہ جانے کتنی مصیبتیں اور اذیتیں جھیلی ہونگی۔ آندھی، طوفان، برسات اور ژالہ باری کے درمیان ہزار پریشانیوں کے بعد میری پرورش کی ہوگی۔ ماں جو اپنی اولاد کے لئے دعاؤں کا ایک ایسا سائبان ہوتی ہے جس کے نیچے اولاد کو ایک تحفظ کا احساس ہوا کرتا ہے۔ کیا وہی شفیق ماں، پیار و ممتا کی دولت لٹانے والی ماں وقت کے ساتھ بدل بھی جاتی ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ بیاہ کے بعد لڑکی میکے والوں کے لئے بالکل غیر ہو جاتی ہے۔ ابھی صبح کا واقعہ بھی وہ بھولی نہیں تھی۔ جب محض معمولی سی بات پر بڑے بھیا نے اسے سخت کھری کھوٹی سنائی تھی اور چھوٹی بہن رعنا وقت پر ناشتہ نہ ملنے کی وجہ سے پاؤں پٹختی ہوئی کالج چلی گئی تھی۔ شیبا کا دل اس وقت بھرا چلا جا رہا تھا اور وہ بے اختیار یہ چاہ رہی تھی کہ وہ اماں کے پاس جائے اور ان سے یہ سوال کرے۔ ''اماں آخر میرا اپنا گھر کون سا ہے؟ تم لوگوں

نے ہی تو خود اپنی مرضی سے وسیم کے ساتھ میرا بیاہ رچایا تھا۔ اب اگر اس نے میرے تمام زیورات شراب اور جوئے کی نذر کر کے مجھے تمہاری چوکھٹ پر واپس بھیج دیا تو اس میں میرا قصور کیا ہے۔ میں نے تو تم لوگوں کے سامنے کبھی اپنی اس دلی تمنا کا اظہار بھی نہیں کیا تھا کہ تنویر میرے دل کی دھڑکنوں میں بسا ہوا ہے۔ اسے میری زندگی میں بسنے کی اجازت دے دو۔

اس کے ہاتھوں میں میرے ہاتھوں کو سونپ دو۔ تمہیں تو اب تک یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ وہ مجھے تم لوگوں سے بھیک میں نہیں مانگنا چاہتا تھا۔ وہ میری زندگی میں بہار بن کر آنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی کھلے عام اپنی محبت کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ نہ کبھی کسی سطحی پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی گہری جھیل کے اندر خاموش محبت کی کارفرمائیاں لہریں لیتی تھیں۔ جنہوں نے مجھے اس کی محبت کا یقین دلایا تھا۔ مگر میں نے والدین کی رضا پر خاموشی کے ساتھ سر جھکا دیا کہ مشرقی لڑکیوں کا یہی دستور ہوتا ہے۔ یہاں لڑکیوں کا اپنی مرضی سے اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنا بے حیائی سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے میں نے تو وہی کیا جو تم لوگوں کی مرضی تھی۔ میں نے بخوشی وسیم کو اپنا شریک حیات مان لیا اور تنویر کی شخصیت کو اپنے دل کے نہاں خانوں سے ہمیشہ کے لئے کھرچ کر دور پھینک دیا۔ جس کے نتیجے میں اب میں ایک خزاں رسیدہ باغ بن کر رہ گئی ہوں اور اس کے دل کے اندر بسنے والی بہار کی حسین پری کے پر جل کر خاک ہو گئے ہیں۔

آخر مجھے یہ کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے؟ کیا لڑکیوں کا ٹھکانہ جب شوہر کا گھر نہیں بن پاتا تو میکے کے دروازے اس پر بند کر دیئے جاتے ہیں؟ اس کا دل ماں سے یہ سوال کرنا چاہتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ وہ وہیں چولہے کے پاس خاموشی سے بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر آنکھوں کے گوشوں میں ہی اپنا وجود فنا کر گئے۔ اور اس کے دل نے تڑپ کر آواز دی ”کوئی بات نہیں اماں تم لوگ مجھے سہارا نہ دو مگر میرا ابھی ایک سہارا باقی ہے۔ وہاں سے مجھے مایوسی نہ ملے گی۔“ یہ سوچ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔ نماز ختم کر کے اس

نے اپنا آنچل اپنے رب کے حضور پھیلا دیا۔ اس پھیلے ہوئے آنچل میں اس کی بے بسی کے آنسو بوند بوند کر کے ٹپک رہے تھے اور وہ پروردگار سے اس کی رحمت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اے پالنے والے میں تیری ناچیز بندی ہوں اور تو رحیم و کریم ہے۔ میرے مالک تو مجھے اور میرے بیٹے کو نظر انداز نہ کر۔ تو نے ہی مجھے وسیم جیسا شوہر عطا کیا ہے۔ جسے نہ میری پرواہ ہے اور نہ میرے بچے کی۔ پروردگار تجھے تیری شان کریمی کا واسطہ۔ تو میرے وجود کے اندر جلنے والی اس آگ کو ٹھنڈا کر دے جو لحہ لحہ مجھے بھسم کر رہی ہے۔ اور میرے شوہر وسیم کو نیک ہدایت دے۔ اس کے دل میں ہم دونوں ماں بیٹے کی محبت پیدا کر دے۔ نماز کے بعد اس کے دل کو کچھ سکون ملا اور وہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ بستر پر لیٹتے ہی نہ جانے کیوں اچانک ہی ایک عرصہ کے بعد اس کی نگاہوں کے سامنے تنویر کی شبیہہ ابھرنے لگی۔

دس سال قبل شیبا کی شادی وسیم سے محض اس بنا پر کر دی گئی تھی کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر ایک انسان کے کردار اور اس کی ازدواجی زندگی کے سکھ اور خوشیوں کے لئے یہ سند کافی نہیں ہوتی۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل تھی کہ وہ شیبا کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں تھا۔ وہ حسن کا ایک جیتا جاگتا مجسمہ اور سنگ تراشی کے تخیل کا پیکر جمیل شاہکار تھی۔ اس کے گلابی گالوں کی رنگت، صندلی بانہیں، یاقوتی لبوں کی کشش ایسی تھی کہ جیسے کالی کالی بدلیوں سے سنہرا چاند جھانک رہا ہو، لانبی لانبی پلکوں کے نیچے شربتی آنکھیں ایک جادو جگاتی رہتی اور سیاہ بالوں کا ایک ڈھیر اس کی پیٹھ پر ہمیشہ جھولتا رہتا۔ دیکھنے والے کی نگاہیں اس کے اس بے پناہ حسن کی کشش سے مسحور ہو جاتیں۔ اگر کوئی سنگ تراش اسے دیکھ کر اس کا مجسمہ تراشتا تو وہ دنیا میں اپنی مثال آپ ہوتا اور اگر کوئی شاعر اس کی خوبصورتی پر غزل لکھتا تو وہ بلاشبہ اس کا شاہکار ہوتی مگر بدقسمت کی بات تھی کہ نکاح کے دو بول کے عوض کانچ کی ایک نازک سی گڑیا پتھر سے جا ٹکرائی اور پھر اس کے بعد دستِ قدرت سے تراشا ہوا ایک بے

مثال شاہکار وسیم کی بداعمالیوں میں اس طرح گم ہو گیا جس طرح چودھویں کا چاند سیاہ بادل میں چھپ جاتا ہے۔

شادی سے قبل شیبا نے تنویر کی دل آویز شخصیت کو چاہا تھا۔ وہ اس کا چچازاد بھائی تھا۔ بے حد خوش اخلاق، بلند کردار اور ایک ہونہار طالب علم، گھر محلے سے لے کر کالج کے ماحول تک کا روح رواں، اس نے شیبا کی من موہنی اور حسین تصویر کو اپنے من کے مندر میں بسالیا تھا۔ اس کی یہ دلی تمنا تھی کہ اپنے خاندان کے اس انمول ہیرے کو اپنے ہی گھر کے تاج کی زینت بنالے۔ مگر اس کے دل کے مقدس جذبوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ خاندانی مخالفت کی اس دیوار کو جس نے لوگوں کے دلوں کو سخت اینٹوں سے بنے اصولوں سے پاٹ رکھا تھا، اپنے پیار کی مدھم آنچ سے پگھلا دے۔

اس کی زبان خاموش رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے شیبا کی ڈولی وسیم کے گھر اتر گئی۔

شادی کے صرف دس ہی سال کے اندر وسیم نے اس کے تمام زیورات، شراب اور جوئے کی نذر کر دیئے اور اب شیبا اس کی بدسلوکیوں کا شکار ہو کر اپنے آٹھ سالہ بیٹے اشہر کے ساتھ اجڑی ہوئی، میکے میں پڑی تھی۔ شوہر کے گھر سے نکلتے ہی میکے میں سب کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا تھا۔ گھر کے تمام کام اس کے سپرد کر دیئے گئے اور وہ محض ایک مشین بن کر رہ گئی۔ معصوم اشہر سہما سہما سا اس کے ساتھ لگا رہتا۔ ایسے ماحول میں رہتے رہتے اس کے تحفظ کا احساس بالکل ختم ہو چکا تھا۔ شیبا اسے اپنے کلیجے سے لگائے تمام ستم خاموشی کے ساتھ سہہ رہی تھی۔ والدین کا گھر جو ممتا اور شفقت کی دہلیز ہوتا ہے وہ اسے ایک ایسے اندھے کنویں کی طرح محسوس ہو رہا تھا جہاں تاریکیوں اور گہرائیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ممتا کی اس دہلیز پر پیار و شفقت کے موتیوں کے بجائے اس پر نفرت و حقارت کے انگارے، شرارے بن بن کر گر رہے تھے۔ جس کی بے پناہ جلن نے اس کے چہرے کی دل آویز رنگ کو بالکل جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے دل و

دماغ پر ایک بھیانک سناٹا چھاتا چلا جارہا تھا۔ متعدد غموں سے نڈھال ہو کر وہ اپنی زندگی سے بیگانہ ہوتی جارہی تھی۔ اور اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ دکھوں کے صلیب پر لٹکی ہوئی یہ حیات اب ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔

شیبا کبھی کبھی میرے پاس آتی اور مجھے کہانیاں لکھتے ہوئے دیکھ کر مجھ سے فرمائش کرتی: ''باجی آپ میری نامراد اور دکھ بھری زندگی پر بھی ایک کہانی لکھ دیں۔ میں اس کے مایوس چہرے پر ایک نظر ڈال کر اسے دلاسہ دیتی۔ شیبا اپنے آپ کو اتنا کمزور اور مجبور نہ بناؤ۔ ہمت سے کام لو۔ تم میٹرک پاس ہو۔ وقت کبھی یکساں نہیں رہتا وہ ہمیشہ ایک نئی کروٹ لیتا رہتا ہے۔ آج اس کے ساتھ ہے تو کل اس کے ساتھ۔ نہ جانے کب یہ ایک نیا موڑ لے لے اور تمہاری دنیا دوبارہ آباد ہو جائے۔ پھر تم اتنا کیوں نہیں سوچتی ہو کہ تمہارے پاس تمہاری اپنی ایک ذمہ داری تمہارا بیٹا بھی تو ہے۔'' لیکن شیبا اب اس قدر ٹوٹ چکی تھی کہ اپنا ٹوٹا ہوا وجود دوبارہ جوڑنا اس کے بس سے باہر ہو چکا تھا۔ فکروں اور دکھوں نے اس کے جسم کو دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔ وہ محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی جسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ صرف ایک ہی سانس کہیں پر اٹکی رہ گئی ہے۔ بالآخر ایک دن محلے میں یہ سنسنی خیز خبر پھیل ہی گئی کہ شیبا نے اپنے جسم پر مٹی کا تیل ڈال کر باورچی خانے میں خود کو آگ لگالی ہے۔ اس کے معصوم بیٹے اشہر پر جیسے ایک قہر ٹوٹ پڑا۔ وہ پتھر کا ایک بت بن گیا۔ اس کی زندگی میں بھونچال سا آگیا۔ اس کی پوری ہستی کھولنے لگی۔ اشہر کو اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں اس نے دیکھا کہ اس کی ماں جو اس دنیا میں اُس کا واحد سہارا تھی دم توڑ چکی ہے۔ ماں کی جھلسی ہوئی لاش کو دیکھ کر وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اس کے منہ سے جو دردناک چیخیں نکلیں انہوں نے شاید آسمان کی وسعتوں میں چھید کردیا ہوگا اور ان آوازوں سے قدرت کا دل بھی دہل گیا ہوگا۔ اُس نے اپنے تمام کپڑے پھاڑ ڈالے اور اسپتال سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔

والدین کی جس چوکھٹ سے کبھی شیبا کی ڈولی اٹھی تھی۔اسی چوکھٹ سے اس بدنصیب کا جنازہ بھی اٹھ گیا۔اس کی لاش کو لوگ سپرد خاک کر کے لوٹ آئے۔میں بھی اپنے گھر واپس آ گئی۔یہ سوچتی ہوئی کہ شاید اب اسے منوں مٹی کے نیچے آرام مل گیا ہوگا۔

میرا ذہن بہت نڈھال ہو رہا ہے۔نگاہوں کے سامنے شیبا کے مردہ خدوخال مرکوز ہو کر رہ گئے ہیں۔ابھی کچھ دیر قبل میری بیٹی نغمہ میرے سامنے چائے کا کپ رکھ گئی ہے مگر میں چائے پی نہ سکوں گی۔کیونکہ چائے کو دیکھ کر مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کپ میں چائے کی بجائے شیبا کا تازہ خون بھرا ہوا ہے۔اور مجھ سے پینے کے لئے کہا جا رہا ہے۔ساتھ ہی کہیں دور سے مجھے شیبا کی آواز سنائی دے رہی ہے۔جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو۔

"باجی میری کہانی لکھ دو۔اور میں سوچ رہی ہوں۔واقعی.........................

شیبا کبھی ایک بھولی بسری کہانی ہی تو بن جائیگی۔اس کی زندگی میں تو میں اس کی یہ تمنا پوری نہ کر سکی۔کیوں نہ اس کی موت کو ہی کہانی کے پیکر میں قید کر دوں۔شاید اس طرح اس کی تشنہ روح کو کچھ قرار مل جائے۔میں نے کاغذ نکالا اور قلم سنبھال کر لکھنے کو بیٹھ گئی۔مگر میں بار بار یہ سوچ رہی ہوں کہ میں اس کہانی کی ابتداء کون سے کردار سے کروں؟ ہر کردار اس کی زندگی میں ولیش بن کر ابھرا اور اس کے پھول سے جسم کو آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا۔

☆☆☆

لمحہ لمحہ موت

تاریک اور سیلن زدہ کوٹھری کا صرف ایک ہی دروازہ تھا۔ سورج کی کوئی کرن اس میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسی تنگ و تاریک گلی میں تھی جس میں سر بفلک عمارتیں کھڑی تھیں۔ اس کے مالکان نے نیچے کے حصے میں بہت سی کوٹھریاں بنوا رکھی تھیں جن میں انسان جانوروں کی طرح رہا کرتے تھے۔ ان کوٹھریوں میں بجلی بھی نہیں تھی۔ ان میں رہنے والے عموماً مٹی کے تیل کے چراغ یا لالٹین جلایا کرتے تھے۔ اسی جگہ ایک کوٹھری میں مریم اپنی بیٹی صوبیہ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ وہ لوگوں کے کپڑے سی سی کر شب و روز کی محنت کے بعد اتنا ہی حاصل کر پاتی تھی کہ معمولی غذاؤں سے پیٹ بھر لے اور میلے کچیلے کپڑوں سے بدن ڈھانپ لے۔ شوہر کے انتقال نے مریم کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ ان حالات میں سخت جان انسان بھی شاید ہی تندرست رہ سکتا ہو۔ بجھی بجھی سی مریم اپنی صحت کی طرف سے لاپرواہ رہتی تھی۔ کیونکہ ایک غریب اور مجبور عورت گھر کے اندر رہ کر تمام رات سلائی نہ کرے تو اور کیا کرے۔ اس کے پاس گزر بسر کا صرف یہی ایک ذریعہ تھا۔ صوبیہ جوان ہو چکی تھی۔ اس فکر نے مریم کی صحت کو متاثر کیا اور وہ خون

کی کمی کا شکار ہوگئی۔ اندرونی طور پر بڑھتے بڑھتے جب مرض شدت اختیار کر گیا تب ایک ڈاکٹر نے اسے مشورہ دیا کہ اچھی غذا کھاؤ، دوا وغیرہ کرو اور کوئی محنت کا کام نہ کرو مگر اس مریض کے لئے یہ سب ممکن کہاں تھا جو روز کما کر روکھی سوکھی کھائے۔ پیٹ کاٹ کر مریم نے جو دو چار چاندی کے زیور صوبیہ کو جہیز میں دینے کے لئے بنا کر رکھے تھے وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ایک ایک کر کے بک گئے۔ اندرونی طور پر بڑھتے بڑھتے مرض جب شدت اختیار کر گیا تو وہ اسے ایک سرکاری اسپتال میں لے گئی جہاں مریضوں کا علاج بھی ہوتا ہے اور انہیں اچھی غذائیں بھی دی جاتی ہیں۔ لیکن مریم کی پہنچ نہ کسی منسٹر تک تھی اور نہ ہی وہ دولت مند تھی۔ اس لئے اسے اس اسپتال میں داخلہ نہ مل سکا۔ صرف معمولی دوائیں دے کر رخصت کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ جب غذا کی کمی اور کڑی محنت نے اس کے جسم سے آخری قطرۂ خون تک نچوڑ لیا تو وہ ایک دن بالکل معذور ہو کر چٹائی سے لگ گئی۔ محلے والوں کو جب مریم کی اس حالت کا علم ہوا تو انہوں نے اس پر ترس کھا کر بس اتنا ہی کیا کہ اسے ایک خیراتی اسپتال میں داخل کروا دیا جہاں بھولی بھالی صوبیہ ہر آنے جانے والے کو اپنی سہمی ہوئی نظروں سے تکتی رہتی۔ حسن و جمال عطیۂ خداوندی ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ امیروں ہی کے حصے میں آئے۔ محلوں ہی میں نہیں جھونپڑیوں میں بھی حسن کے شاہکار نظر آتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ایسے ہیروں کی مانند ہوں جو کیچڑ میں پڑے رہتے ہوں۔ صوبیہ کو قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ حسن کی دولت بخشی تھی۔ شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی اس پر حسن ایسا ٹوٹ کر آیا تھا جو پھٹے پرانے کپڑوں میں نہ سماتا تھا۔ گرد و غبار میں اٹے رہنے کے باوجود اس کا حسن جہاں تاب چودھویں رات کے اس چاند کا عکس پیش کرتا تھا جس کی ٹھنڈی میٹھی شیتل چاندنی دلوں میں ایک مدھر راگ پیدا کر کے جادو جگاتی ہے۔

مریم کو اپنی بیٹی کی اس دولت کا علم تھا۔ اس لئے مفلسی کے باوجود اسکا وجود صوبیہ کے لئے ایک مضبوط سائبان کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کے لب پروردگار کی بارگاہ میں فریاد بہ لب

رہے کہ مالک میرے اٹھنے سے پہلے تو میری بیٹی کو اپنے گھر بار کا کر دے۔ غریب ماں کی دعا ابھی مستجاب بھی نہ ہو پائی تھی کہ وہ اس حالت کو پہنچ گئی۔ مریم جس وارڈ کے اندر ایک بیڈ پر پڑی تھی وہاں ایسے مریضوں کی قطاریں تھیں جو صرف اس امید پر اپنے دلوں کی دھڑکنیں گن رہے تھے کہ شاید قدرت انہیں وہ لمحہ عطا کر دے کہ وہ اپنے مردہ وجود کے اندر زندگی کی توانائی کو محسوس کرنے لگیں۔ شاید یہ انسانی فطرت ہے یا زندگی سے اٹوٹ چاہت کا جذبہ کہ جب کسی ہستی حیات کے دروازے پر موت ہلکی ہلکی دستک دینے لگتی ہے تو وہ چاہے پہاڑ کی گھاٹیوں میں بسیرا لیتی ہو یا سمندر کی گہرائیوں میں، موت کے خوفناک پنجوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کے اندر زندہ رہنے کی تڑپ شدت سے جاگ اٹھتی ہے۔

مریم کو اس اسپتال میں داخل ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ یہ دسمبر کی سردی کا وقت تھا۔ اس یخ بستہ موسم میں رات کی تاریکی کا مہیب آنچل فضا پر اس طرح پھیلا ہوا تھا جیسے دور کہیں کسی عفریت کا بھیانک ناچ ہو رہا ہو۔ یا رات کی خونی پری دف بجا رہی ہو۔ وارڈ کے اندر گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز اس طرح سنائی دے رہی تھی جیسے کسی جاں بلب مریض کا سانس چل رہا ہو۔ مریم نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہ رہی تھی۔ صوبیہ مجسمہ بنی اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی اس کی جلتی پیشانی کو سہلا رہی تھی۔ اس کی سوگوار آنکھیں بے بسی کا ایک سمندر سمیٹے ہوئے ماں کے زرد چہرے پر ٹکی تھیں، اور نازک نازک لب سختی سے ایک دوسرے کے ساتھ بھینچے تھے۔ مریم کا مرض اسے موت کے قریب تر کرتا جا رہا تھا اور اندرونی کرب اور بے چینی کی وجہ سے اس کی نیند اس سے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ اس وقت اس پر سکوت ماحول میں اچانک ہی اس کے ہونٹوں سے ایک کربناک آہ نکل گئی اور اس نے آنکھ کھول کر ایک نظر اپنی خوبصورت بیٹی کے چہرے پر ڈالی اور دوبارہ آنکھ بند کر لی۔ آنکھ بند کرتے ہی اس کا ذہن اسے اسی وقت بے چارگی کی اس دنیا سے نکال کر ماضی کی اس شاہراہ پر لے گیا جب وہ شباب کی منزل میں تھی اور بیاہ کر سسرال آئی تھی۔ اس

وقت اس کے گداز اور سڈول جسم میں مسرت اور شادمانی کی امنگیں موجزن تھیں اور اس کی مسرور وشاداں روح کا ایک ایک تار فطرت کے ساتھ غزل خواں تھا۔ اس کا شوہر طارق ایک خوبرو اور نیک انسان تھا۔ اس کی یاد سے اس کے دل کے اندر ایک ٹیس سی اٹھی۔ وہ مریم سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ کبھی بھی اس نے اسے رنجیدہ نہیں کیا تھا۔ وہ ایسی پیاری محبت آمیز باتیں کرتا تھا جو دل کے شیشے کو پگھلا کر رکھ دیتی ہیں۔ اس کے خیالات اور احساسات میں انسانیت کا سچا درد تھا۔ اسکی زبان سے ادا کئے گئے تمام الفاظ پیار و محبت اور جوش و ولولے کا ابلتا ہوا چشمہ تھے۔ افسوس وہ اس چشمے سے اچھی طرح سیراب بھی نہیں ہو پائی تھی کہ اجل کے بے رحم ہاتھوں نے اسے اس سے چھین لیا۔ کتنی آرزوئیں اور تمنائیں اس کی ذات سے وابستہ تھیں جو عین عالم شباب میں اس سے جدا ہو گئیں اور وہ اس کی ننھی سی نشانی صوبیہ کے ساتھ اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔

گزشتہ زندگی کے گزرے ہوئے خوشیوں سے بھرپور ان لمحوں کو یاد کرتے کرتے مریم کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ نکل گئی اور وہ سوچنے لگی کہ اب تو حالات نے مجھے ایک ایسی دنیا میں منتقل کر دیا ہے جہاں ہر طرف مایوسیوں اور حسرتوں کا ایک ہجوم ہے۔ زندگی کی اس پت جھڑ میں گھر کر میں بہاروں کے ان لمحوں کو کیوں یاد کرنے لگتی ہوں جن سے اب میرا کوئی رشتہ نہیں رہا۔ اب تو زندگی کی شام آ چکی ہے اور اس کا ٹمٹماتا ہوا دیا نہ جانے کب بجھ جائے۔ میرے بعد کون جانے اس ظالم دنیا میں میری بیٹی کا کیا ہوگا؟

آج کی شب مریم کی بے چینیوں نے شدت اختیار کر لی تھی۔ شدت نقاہت سے جب اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تو اس کے سرہانے بیٹھی صوبیہ گھبرا گئی اور بار بار اسے آوازیں دینے لگی۔ مگر اس کے لبوں کو جنبش تک نہ ہوئی۔ یہ حالت دیکھ کر صوبیہ زار زار رونے لگی۔ اس کی دلفگار آوازیں سن کر کچھ لوگ اس کے پاس آ گئے اور اس کی بے ہوش ماں کو دیکھ کر انہوں نے ازراہ ہمدردی اسے ڈاکٹر پرویز کے کلینک جا کر ان سے ملنے کو کہا۔ رات کسی طرح گزری تو صبح

ہونے کے کچھ دیر کے بعد صوبیہ ہواس باختہ سی اسپتال کے احاطے سے باہر نکل کر ڈاکٹر پرویز کے کلینک کی طرف دوڑ گئی۔ اسپتال سے تھوڑے ہی فاصلے پر ڈاکٹر پرویز کا کلینک تھا۔ صوبیہ نے کبھی کبھی ڈاکٹر پرویز کو اسپتال کا راؤنڈ لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔

ڈاکٹر پرویز ایک رنگین مزاج آدمی تھے لیکن ان کے ہتھکنڈے ایسے مضبوط تھے کہ عوام میں ان کی بے حد شہرت تھی۔ ایک کامیاب سرجن کی حیثیت سے ان کا نام بیرون ملک تک میں لیا جاتا تھا۔ ان کے کلینک میں شب و روز لوگوں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا۔ اکثر لوگ انہیں دیوتا تک کا درجہ دیتے تھے۔ حالانکہ باطنی طور پر وہ ابلیس کے چیلے تھے۔ وہ ایک دولت مند خاندان کے چشم و چراغ تھے اس لئے دولت عزت اور شہرت ان کے قدم چومتی تھی۔ آرام و آسائش کے اسباب نے انہیں زندگی کی دشوار گزار راہوں کا کوئی تجربہ ہونے نہیں دیا تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ انسانی خوشیوں کے تمام سوتے دولت و حشمت کے چشمے سے پھوٹا کرتے ہیں۔ یہی وہ واحد شے ہوتی ہے جس سے دنیا کا ہر سکھ خریدا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ اس لئے نفس عمارہ کو مطمئن کرنے کے لئے مجبور اور لاچار جوانیوں کے متلاشی رہا کرتے تھے۔ دولت کی فراوانی اور اونچی سوسائٹی کے ماحول نے ان کے ذہن کو اس قدر رنگیں بنا دیا تھا کہ ہر خوبصورت لڑکی انہیں ایک ایسا چھلکتا ہوا جام نظر آتی تھی جس سے اپنے جسم کی پیاس بجھانا وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ جس وقت بدحواس اور بدنصیب صوبیہ ان کے کلینک میں داخل ہوئی اس وقت اس کا چہرہ کسی قسم کے تصنع سے بے نیاز غم و الم کی ایک تصویر نظر آ رہا تھا۔ اگر ڈاکٹر پرویز کے دل میں ذرا بھی انسانیت ہوتی تو اس حالت میں دیکھ کر ان کا دل لرز اٹھتا لیکن انہوں نے ایسی حالت میں بھی صوبیہ کو اس طرح دیکھا جیسے وہ ایک شکاری ہوں اور شکار ان کے سامنے بے بس کھڑا ہو۔ اس سے قبل کہ وہ بے سہارا لڑکی ان سے اپنے دل کا مدعا بیان کرتی ان کی ہوس ناک نظریں اس کے خوبصورت خد و خال کا جائزہ لینے لگیں۔ تیکھے نین نقش، چنچل ہرنی کی سی بے چین آنکھیں اور سڈول جسم ان کے

پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ انہیں لگا کہ جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے اپنے شاہکار میں جان پھونک کر اسے یہاں لا کھڑا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر پرویز کی شیطانی نگاہیں صوبیہ کے معصوم چہرے پر جمی تھیں اور وہ اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے سے لگاتار بہنے والے آنسوؤں کو خشک کر رہی تھی۔

درمیانے قد کی نازک سی من موہنی لڑکی جو چاند کی طرح خوبصورت تھی وہ ایک ہی نظر میں ان کے دل کو بھا گئی تھی۔ اس کے لباس اور اس کی شکستہ حالی سے وہ اس کی مجبوریاں تاڑ گئے تھے۔ لہٰذا بہت ہی میٹھے لہجے میں اس سے سوال کیا، ''گھبراؤ نہیں کیا بات ہے، کیا چاہتی ہو؟'' صوبیہ کو ان کے اس شائستہ لہجے اور مہذب انداز گفتگو سے بڑی ڈھارس مل گئی۔ اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے انہیں بتایا، ''ڈاکٹر میری ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ اس خیراتی اسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔ آپ اسے بچالیں ڈاکٹر بابو، ماں کے سوائے میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر پرویز نے زیر لب مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی ''گھبراؤ نہیں میں تمہاری ماں کا علاج ضرور کروں گا اور وہ اچھی بھی ہو جائے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور صوبیہ کے ساتھ اس کی بے ہوش ماں کے بیڈ کے قریب آئے۔ مریم کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں پتہ چلا کہ اسے فوری طور پر خون پہنچانے کی ضرورت ہے۔ وہ مریم کا معائنہ کر رہے تھے اور صوبیہ کی پر امید نگاہیں ان کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے ایک سرسری سی نظر صوبیہ پر ڈالی اور اس سے کہا ''میں اپنے کلینک جا رہا ہوں۔ تم وہیں آکر مجھے مل لینا۔'' یہ سنتے ہی اس نے بے صبری سے سوال کیا۔ ''ڈاکٹر بابو میری ماں ٹھیک تو ہو جائے گی؟'' صوبیہ کے اس معصومانہ سوال پر انہوں نے اسے تسلی دی۔ ''کیوں نہیں، ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔'' ڈاکٹر صاحب کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی اس کے پژمردہ چہرے پر یکبارگی دھنک کے سے رنگ بکھر گئے۔ ڈاکٹر صاحب اسے ایک فرشتہ نظر آ رہے تھے۔ وہ اس عظیم انسان

کی بے حد ممنون تھی جو اسے تاریک اور مایوس دنیا کی بھیانک وادی سے نکال کر زندگی کے خوش رنگ نخلستان میں لے آیا تھا۔ اس بدنصیب لڑکی کو ابھی اتنی سمجھ ہی کہاں تھی کہ وہ اس کے چہرے پر کھیلنے والی شیطانی مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ پاتی۔ اسے اتنا پتہ ہی کہاں تھا کہ غرور اور تکبر کی چھاؤں میں پلنے والا انسان آج دنیا میں جہنم کے اس شعلے کی مانند ہو گیا ہے جو غریبی مفلسی اور بے چارگی کے آنچل پر لہراتا ہے۔

ڈاکٹر جب اپنے کلینک میں واپس آئے تو صوبیہ کا کنوارا اچھوتا حسن ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا کر رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے تصورات کی دنیا میں کھوئے تھے اور ایک الڑھ سی جوانی ان کے خیالات کی دنیا میں رنگینی بن کر چھا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد قدموں کی چاپ سن کر جب انہوں نے نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ صوبیہ ان کے سامنے کھڑی ہے۔ نیچی نظر سر پر دوپٹے کا آنچل جس سے باہر نکل کر لمبے سیاہ بال ادھر ادھر لہرا رہے تھے۔ ڈاکٹر پرویز نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی اور کہا ''اپنی ماں کو مجھے دکھانے میں تم نے بہت دیر کر دی۔ اب تک کہاں تھیں؟'' صوبیہ نے کہا ''کل رات ہی آپ کا نام سنا ہے۔ اب تک خیراتی اسپتال کی دوا چل رہی تھی۔''

ڈاکٹر پرویز نے للچائی ہوئی نظروں سے صوبیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''دیکھو میں تمہیں کسی اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا ہوں اب یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہاری ماں شدید قسم کی خون کی کمی کا شکار ہو چکی ہے۔ اگر اسے فوری خون نہیں پہنچایا گیا تو کسی وقت بھی اس کی موت ہو سکتی ہے۔''

صوبیہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔ ڈاکٹر بابو میں ان باتوں کو کیا جانوں میں تو بس اتنا ہی جانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔ اور اگر آپ میری ماں کا علاج کر دیں گے تو وہ ضرور اچھی ہو جائے گی۔ آپ ہم غریبوں پر یہ احسان کر دیں ڈاکٹر بابو، ہم ماں بیٹی تمام

عمر آپ کا یہ احسان نہ بھولیں گی۔'' ڈاکٹر پرویز نے آہستہ لہجے میں صوبیہ سے کہا ''مجھے تمہاری ماں کے علاج سے کوئی انکار نہیں ہے مگر کیا تم اس کا علاج کرواسکو گی؟ بہت مہنگا علاج ہوگا۔ مرض بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ پھر بھی میں پوری کوشش کروں گا۔'' صوبیہ نے یاس بھری نظروں سے ڈاکٹر پرویز کو دیکھتے ہوئے کہا ''ہمارے پاس تو بس آپ کی فیس بھر کے ہی روپے ہیں۔ میری ماں اب کام نہیں کرتی، اس لئے جو کچھ بھی تھا وہ سب بک چکا ہے۔'' پرویز نے قدرتامل سے کہا ''کیا ہزار دو ہزار کا بھی انتظام نہیں کرسکتی ہو؟'' صوبیہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''حضور ہم تو دس بیس کا بھی انتظام نہیں کرسکتے۔ ہمارا حال بس اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' پرویز نے کہا ''میں دوائیں اور ایک انجکشن دے دیتا ہوں۔ یہ انجکشن اسپتال میں کسی سے کہہ کر لگوادینا اور شام تک یہ کیپسول اور گولیاں چار چار گھنٹے بعد تین مرتبہ کھلا کر میرے پاس حال بتانے آجانا۔ پھر میں دیکھوں گا کہ کیا ہوسکتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کو دل ہی دل میں ہزاروں دعائیں دیتی ہوئی صوبیہ کلینک سے باہر نکل آئی۔ اس کے دل کے اندر امید کی کرن پھوٹ پڑی تھی۔ انجکشن اور دوا نے مریم کو سکون بخشا اور جب وہ ہوش میں آئی تو صوبیہ نے ماں سے کہا ''ماں ڈاکٹر صاحب ایک فرشتہ ہیں، انہوں نے بہت وقت پر ہمارا ساتھ دیا ہے لیکن ....'' مریم نے پوچھا ''لیکن کیا بیٹی؟'' یہی کہ انہوں نے اس علاج پر کم از کم ہزار دو ہزار کا خرچ بتایا ہے۔ یہ رقم کہاں سے آئے گی ماں؟ آج تو انہوں نے دوا کے دام نہیں لئے ہیں۔ بڑے رحم دل آدمی ہیں۔'' مریم نے پر امید لہجے میں بیٹی سے کہا ''ڈاکٹر صاحب اتنے رحم دل آدمی ہیں، شاید انہیں ہماری غریبی پر رحم آجائے اور وہ قرض دوائیں دے دیں۔ میں اچھی ہوگئی تو ان کا ایک ایک پیسہ ادا کروں گی۔ بڑے آدمی ہیں، پھر دوائیں تو ان کے یہاں رہتی ہی ہیں۔ خدا ان کے دل میں نیکی ڈال دے اور وہ ہمیں قرض دوائیں دیتے رہیں۔ اس انجکشن اور دوا سے مریم کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی مہربانیوں سے وہ

ضرور بچ جائے گی اور پھر کام کر کے صوبیہ کے لیے جہیز اکٹھا کرے گی اور اس کے ہاتھ پیلے کردے گی۔ شام کے وقت ڈاکٹر پرویز صرف پانچ مریضوں کو دیکھتے تھے۔ اس لئے صوبیہ جب اپنا بدن چرائے اور نگاہیں جھکائے کلینک میں داخل ہوئی تو اس وقت وہاں پر چند ہی مریض تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے کر کلرک نے اسے اندر جانے دیا۔ ڈاکٹر پرویز نے مسکرا کر صوبیہ کو دیکھا اور اس سے پوچھا ''کیا حال ہے مریض کا؟'' صوبیہ نے کہا ''آپ کی دوا سے آج ماں کو آرام رہا ہے۔'' ''تم اگر اپنی ماں کو بچانا چاہتی ہو تو تین مہینے تک مسلسل دوائیں چلیں گی اور انجکشن لگیں گے لیکن تم کہتی ہو کہ روپیہ نہیں ہے۔ خیر میں تمہاری ماں کو دیکھ کر دوا لکھ دوں گا۔ میرے ساتھ چلو۔'' صوبیہ ایک متحمل کی طرح ڈاکٹر پرویز کے ساتھ اس کے کلینک سے باہر نکلی۔ پرویز نے چپراسی سے کہا ''میں مریض دیکھنے جا رہا ہوں۔ وہیں سے کوٹھی چلا جاؤں گا۔ کار کے پاس جا کر ڈاکٹر نے صوبیہ سے بیٹھ جانے کو کہا اور پوچھا کہاں رہتی ہو تم؟'' صوبیہ نے اپنا پتہ بتا دیا۔ کار چل پڑی لیکن وہ اس کی گندی کوٹھری کے بجائے، ایک شاندار بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔ ڈاکٹر نے کہا ''میرے ساتھ آؤ۔ میں چائے پی لوں اور کچھ دوائیں لے لوں تو تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے اس کمرے کو دیکھا جس میں وہ ڈاکٹر کے ساتھ ابھی ابھی داخل ہوئی تھی۔ ایسے مکانوں کو اس نے باہر سے ہی دیکھا تھا، اندر جانے کا اسے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ شیش محل میں جو حالت فقیر کی ہوتی ہے وہی اس وقت صوبیہ کی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا ''بیٹھ جاؤ'' صوبیہ ڈرتے ڈرتے قالین پر بیٹھ گئی۔ پرویز نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اس پر بیٹھو، ڈرو نہیں۔'' صوبیہ قالین سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ لرز رہی تھی اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر اس پر اتنا مہربان کیوں ہے؟ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ ''کہیں ڈاکٹر اسے لوٹنا تو نہیں چاہتا۔'' پرویز نے سگریٹ سلگا کر صوبیہ سے کہا ''دو ہزار کے قریب تمہاری ماں کے علاج پر خرچ ہوگا۔ اگر علاج نہ ہوا تو تمہاری ماں مر جائے گی اور تم اس دنیا میں

ٹھوکریں کھاتی پھرو گی۔''

''نہیں، نہیں'' صوبیہ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا ''ایسا نہ کہئے ڈاکٹر صاحب۔ اپنی ماں کو بچانے کے لئے میں بھیک مانگوں گی، اپنی ماں کو بچانے کے لئے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' ڈاکٹر پرویز کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھل گئی اور انہوں نے صوبیہ کے قریب آتے ہوئے کہا ''میں تمہاری ماں کا علاج پوری توجہ کے ساتھ کروں گا۔'' تمہاری غریبی سے مجھے از حد ہمدردی ہے۔'' پھر انہوں نے اس کے سراپے کا ایک بھرپور جائزہ لیا اور سپاٹ لہجے میں کہا ''ارے تم اپنی ماں کے علاج کے لئے سب کچھ کر سکتی ہو تو مجھ سے ایک سودا کر لو۔''

''وہ کیا ڈاکٹر صاحب؟'' اس کی معصوم نگاہیں ایک سوالیہ نشان بن کر ان کے چہرے پر ٹک گئیں۔ اس کی اس سادگی اور معصومیت پر انہوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ شاید کبھی شیطان ہنستا ہوگا تو اس کی ہنسی بھی اتنی ہی بھیانک اور مکروہ ہوتی ہوگی۔ بھرپور قہقہہ لگانے کے بعد انہوں نے صوبیہ کو سمجھانے کے سے انداز میں کہا ''مطلب یہ کہ تمہاری ماں کے علاج پر کم از کم دو ہزار خرچ ہوگا۔ اگر تم اتنا خرچ کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں تمہیں اپنا یہ خوبصورت جسم ہمارے حوالے کرنا ہوگا۔ اچھی طرح سوچ لو وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اب اگر علاج میں ذرا بھی دیر ہوئی تو پھر وہ بچ نہیں سکے گی۔'' ڈاکٹر پرویز کے یہ بے رحمانہ الفاظ صوبیہ کے دل و دماغ پر بجلی بن کر گرے اور وہ آنکھیں پھاڑ کر مبہوت سی اس انسان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی جو ابھی کچھ دیر قبل اس کے لے ایک دیوتا کا درجہ رکھتا تھا۔ لمحہ بھر کے اندر ہی ایک دیوتا کی ذات خاک کے ایک حقیر ذرے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی سوگوار آنکھیں پژمردہ ہونٹ اور زرد زرد سے رخسار شرم و حجاب کی وجہ سے سرخ ہو گئے اور وہ اپنی جگہ بالکل ساکت و جامد ہو کر رہ گئی۔ اگر اس وقت اسے کوئی بابصیرت انسان غور سے دیکھتا تو اسے ایسا لگتا کہ جیسے کوئی ماہر سنگ تراش ایک حسین بت کو اس جگہ تراش کر نصب کر گیا ہے۔ پھر دفعتاً ہی وہ پورے جسم سے کانپنے لگی

اور اس کا دل یہ چاہنے لگا کہ وہ اس غلیظ انسان کے چہرے پر تھوک کر کہیں بھاگ جائے۔ اپنی ماں کی زندگی کی بقاء کے لئے وہ اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی۔ اپنے اس خیال کو وہ عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی کہ اچانک ہی ایک خوفناک خیال کسی زہریلے ناگ کی طرح پھن اٹھا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جب ماں کا سایہ اس کے سر پر نہ ہوگا تو وہ کہاں جائے گی؟ پھر تو نہ جانے کتنے ظالم بھیڑیئے اس کے جسم کی آخری بوٹی تک نوچ ڈالیں گے۔ دفعتاً اس کا سر بڑے زور سے چکرایا اور وہاں پر کھڑے کھڑے اسے لگنے لگا کہ اس کی ماں کا سایہ جو اس کے لئے ایک بند چہار دیواری کی حیثیت رکھتا تھا وہ اچانک ہی گر گیا ہے۔ وہ تنہا ایک کھلے میدان میں کھڑی ہے اور ہر طرف سے لوگ آ آ کر اس کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔ اس کی ہڈیاں تک کھا جانے اور چبا جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ مگر اس کی مدد کے لئے کوئی بھی اس کے پاس نہیں آرہا ہے۔ جب صوبیہ کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ کمرے کا دروازہ بند ہے اور ڈاکٹر پرویز ایک باز کی طرح اس پر حاوی ہو چکے ہیں۔ وہ اس درجہ بے بس ہے کہ اس میں مدافعت کی بھی طاقت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اور ڈاکٹر کا حربہ کامیاب ہو چکا تھا۔ صوبیہ کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ اور اس کے پاس خاموشی سے ہر بات پر حامی بھرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں اور لبوں سے آنسوؤں اور آہوں کا ایک سمندر امڈا چلا آرہا تھا بے بسی اور بے چارگی کے اس بے پناہ سمندر میں ڈاکٹر اپنی دولت اور ڈگری کی پتوار کا سہارا لئے پار اتر گئے۔ ہوس کے ایک بھیانک دیو نے ایک غریب ضرورت مند ماں کی کنواری جوان بیٹی کی آبرو کا وہ موتی نگل لیا جس کی اس بدنصیب نے سولہ سالوں تک ایک آبگینہ کی طرح حفاظت کی تھی۔ ایک بھولی بھالی معصوم لڑکی اس لئے لٹ گئی کہ وہ ہر قیمت پر اپنی ماں کی زندگی بچانا چاہتی تھی۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ اگر اس کی ماں کا سایہ اس پر قائم نہ رہ سکا تو نہ جانے کتنے ظالم بھیڑیئے اور خوش پوش درندے اس کے نازک جسم کو نوچتے رہیں گے۔ بہتوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بہتر ہے

کہ وہ ایک ہی کے ہاتھوں بک جائے۔ اس طرح کم از کم وہ اپنی ماں کو تو بچالے گی۔ ایک بیٹی کا اپنی ماں کی زندگی بچانے کے لئے یہ ایثار عجیب وغریب تھے۔ ماں کو بچانے کے لئے شاید اسے اپنی عزت وناموس کا سودا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن عزت اور آبرو غریبوں کے پاس ہوتی ہی کہاں ہے۔ ان کی آبرو کی قیمت ہی کیا ہوتی ہے۔ حالات اور مجبوریاں انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیتیں۔ صوبیہ کے پاس بس یہی ایک دولت تھی جسے اس نے ماں کی زندگی بچانے کے لئے قربان کر دیا اور پھر دکھے دل سے سوچنے لگی۔ آخر مجھے یہ کس قصور کی سزا ملی ہے۔ کیا میرا یہ جرم ہے کہ میں ایک غریب ماں کی بیٹی ہونے کے باوجود جوان اور خوبصورت تھی۔ یا یہ میری اس بھول کی سزا تھی جو اس نے ڈاکٹر پرویز کو ایک فرشتہ سمجھ لیا تھا۔

بہر حال اپنے لٹنے کا تماشہ دیکھنے کے بعد صوبیہ اپنا ٹوٹا بکھرا وجود لے کر ڈاکٹر کے یہاں سے واپس اپنی ماں کے پاس آ گئی۔ ڈاکٹر پرویز نے صوبیہ کو لوٹنے کے بعد اپنی نگاہیں نہیں پھیریں۔ وہ حسن کا ڈاکو تھا۔ مگر وعدے کا پابند بھی تھا۔ اس نے مریم کے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور اپنے اثر ورسوخ سے اسے اسپتال میں بیڈ دلا دیا جہاں اسے اچھے سے اچھا کھانا ملتا تھا اور قیمتی دوائیں بھی دی جاتی تھیں۔ اس لئے مریم کا رویاں رویاں ڈاکٹر پرویز کا شکر گزار تھا۔

دو ماہ بعد جس روز مریم کو اسپتال سے چھٹی ملی اس روز ڈاکٹر پرویز اسے دیکھنے کے لئے آئے۔ مریم نے ہاتھ جوڑ کر ان سے کہا ''ڈاکٹر بابو اگر آپ جیسے لوگ اس دنیا میں نہ ہوں تو ہم غریب لوگ بے موت مر جائیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ محنت کر کے جو کچھ بھی کما سکوں گی روکھی سوکھی کھا کر آپ کا قرض چکا دوں گی۔'' ڈاکٹر پرویز نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ صوبیہ کی طرف دیکھا جو ایک مرجھائے پھول کی مانند نظر آ رہی تھی اور پھر مریم سے کہا ''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ میرا فرض تھا۔'' اور آگے بڑھ گئے۔ مریم ڈاکٹر پرویز کو دعائیں دیتی ہوئی صوبیہ کے ساتھ اپنی کوٹھری میں واپس آ گئی۔ اس کے ایک

ہفتہ کے بعد اخبارات میں دو خبریں شائع کی گئیں :

''مشہور سرجن ڈاکٹر پرویز اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے۔ کسی نے سوتے میں تیز دھاردار خنجر سے ان کا قتل کر دیا۔ قتل کا سبب معلوم نہیں۔''

دوسری خبر تھی :

''دریا گنگا سے ایک غریب جوان لڑکی کی لاش برآمد ہوئی ہے۔ غالباً اس لڑکی نے خودکشی کی ہے۔ لاش کی شناخت ابھی تک نہیں ہو سکی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتہ چلا ہے کہ لڑکی حاملہ تھی۔''

اور اس کے دو روز کے بعد ایک اور خبر اخبارات کی زینت بنی :

''ایک غریب عورت نے جو لوگوں کے کپڑے سی کر اپنا گزر بسر کیا کرتی تھی اپنے گلے میں رسی کا پھندا لگا کر خودکشی کر لی۔ یہ ایک ہفتہ قبل ہوسپٹل سے صحت یاب ہو کر آئی تھی۔ پاس پڑوس والوں کا بیان ہے کہ دو روز قبل دریا میں ڈوب کر خودکشی کرنے والی جوان لڑکی اس غریب عورت کی بیٹی تھی۔ پولس اسباب معلوم کرنے کی تگ و دو میں ہے۔''

☆☆☆

اب کون آئے گا یہاں......؟

رات کی آنکھوں سے خمار جھلکنے لگا ہے۔ نہ جانے میں کب سے لکھ رہی ہوں۔ لکھتی جارہی ہوں۔ شاید قلم کی روانی میں بھی اب تھکاوٹ پیدا ہوگئی ہے مگر میں کیا کروں، مجھے لکھنا ہے۔اس لئے میں لکھتی ہوں اور جب تک زندہ رہوں گی لکھتی رہوں گی۔ کیونکہ قلم ہی میرے جینے کا سہارا ہے، میرا حاصل حیات ہے۔ اگر نہ لکھوں تو پھر زندہ رہنے کا کون سا ذریعہ میرے پاس باقی رہ جائے گا۔اس وقت بھی سفید کاغذات اپنے سینے پر سیاہ الفاظ کے داغ منتقل کرتے کرتے سیاہ ہوتے چلے جارہے ہیں۔ رات ڈھلتی جارہی ہے اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ تمہاری یادوں کا جادو سحر بن کر میری ہستی پر حاوی ہوتا جارہا ہے۔ میں تمہیں کیسے بھول جاؤں، میرے تصور کی دنیا پر تم حاوی ہو۔تمہارا وہ خیالی وجود کا وہ خاکہ جو میرے لئے شمیم گل اور موج صبا کا لچکتا ہوا دامن ہے جس کے اندر قلب شبنم کی صفات ہیں۔اور جس کا وجود پھولوں کی رنگین قبا سے مزین ہے، جس کے ہجر میں تڑپنے والی میں ایسی بیمار ہوں جس کی دوا محض تم ہو۔ میں جس ہستی کی شیدا ہوں وہ پاک باز شیریں چشمہ تم ہو۔ گرچہ تم نے اپنی فرقت میں مجھے بے حد تڑپایا ہے،

مگر میں تمہیں یہ کیسے بتاؤں کہ یہ مجھ پر تمہارا ایک گراں بہا احسان تھا کہ اس تڑپ اور کسک نے میرے فکروفن کی دنیا میں ایک انوکھا نکھار پیدا کر دیا۔ میری نگاہوں سے اوجھل رہتے ہوئے بھی میرے آرٹ وفن کی دنیا کو تم نے ہی منور کیا ہے۔ تم وہ جگمگاتی ہوئی شمع ہو جس سے میرے تخیل کی حسین دنیا ضیاء بار ہوتی رہتی ہے۔ میرے قلم کی تخلیق کردہ ہر تخلیق کے خالق تم ہو۔ میں نے تمہیں نہ پاکر بھی ہمیشہ کے لئے پالیا ہے۔ تمہیں اپنی زندگی کی کشتی کا بادبان بنالیا ہے۔ اس بادبان کے سہارے مجھے یقین ہے کہ میری کشتی حیات ضرور علم وادب کی کامرانی کے ساحل تک پہنچ جائے گی۔ میری ہستی حیات کے ساحل پر جگمگانے والے چاند تمہیں کیا پتہ کہ چکور تمہارے لئے کس طرح بے قرار رہا ہے۔ میرے گلشن حیات کو معطر کرنے والے گل تم کیا جانو کہ بلبل کی زمزمہ سنجی کس طرح اپنے درد دل کا اظہار کر رہی ہے۔

زندگی ایک بہت پر کشش شے ہے۔ یعنی زندگی نام ہے حسین امیدوں کا، خوش آئند احساس کا، ماہ وسال کے درمیان گزرنے والے نشیب وفراز کا۔ یہ نعمت اللہ نے اوروں کے ساتھ مجھے بھی بخشی ہے اور میں زندہ ہوں۔ مگر تنہائی کبھی کبھی مجھ سے یہ سوال کرتی ہے کہ آخر میں کیوں زندہ ہوں۔ اب میرے پاس کیا رہ گیا ہے؟ وقت کی تیز رفتار کے ساتھ سب کچھ ختم ہوگیا۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا، پھر بھی وہ کون سا جذبہ ہے جو مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ جس کے سہارے میں زندہ ہوں۔ زندگی کی پیہم شکستوں نے میری حسین شخصیت کو دیمک کی طرح چاٹ ڈالا ہے، میرا وجود ٹوٹ کر ذروں میں بٹ چکا ہے۔ حالات کی سنگینی اور وقت کے بے رحم تھپیڑوں نے مجھے زندگی کے اس موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں پہنچ کر دل کو نہ غم کا احساس ستاتا ہے اور نہ خوشی کا کوئی لمحہ مسرت بخشتا ہے۔ میری ویران زندگی اب حیات کی اس ڈگر پر کھڑی ہے جہاں ایسا احساس ہوتا ہے کہ جیسے ایک پرندے کے تمام بال وپر نوچ کر ایک ایسے ویرانے میں چھوڑ دیا گیا ہو جہاں سے پرندے کے واپس آنے کی کوئی امید نہ ہو۔ مگر وہ بدنصیب پرندہ پھر بھی اس آس پر

زندہ ہو کہ دوبارہ بال و پر نکلنے کے بعد وہ پرواز کے قابل ہو جائے گا۔ لیکن اسے اس کا احساس تک نہیں کہ کیا دوبارہ بال و پر نکلنے تک وہ زندہ بھی رہ پائے گا یا نہیں؟ ٹھیک اس پرندے کی مانند میں بھی زندہ ہوں کیونکہ زندگی ہزار تلخ سہی، زہر سہی، ناکام سہی، پھر بھی زندگی ہے۔ کائنات کی سب سے قیمتی شے، سب سے حسین نغمہ، سب سے لطیف جنس۔ میں نے ہمیشہ اس نظریے کی قدر کی ہے۔ زندگی کے اسی دلفریب نظریے نے مجھے بھی اپنی پلکوں پر خوش آئند خواب بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

جب میں نے چمنستان زندگی کی سولہویں بہار میں قدم رکھا تھا تو اس وقت مجھے محسوس ہوا تھا کہ میری اچھوتی جوانی جو بے شک کسی منہ بند کلی کی طرح تھی وہ کسی مچلتے ہوئے آبشار کی مانند ابلنے لگی ہے۔ میں اتنی معصوم اور پاکیزہ ہوں کہ میری عظمت کی کہانی فضاؤں کے دوش پر مچل رہی ہے۔ میری معصوم اور پاکیزہ زندگی کی معصومیت اور پاکیزگی پر کائنات عالم کے چمن کی ہر خاموش کلی کو پیار آ رہا ہے۔ میرے تقدس پر بہاریں آ کر میرے آنگن میں پرستش کرنا چاہ رہی ہیں اور چاند ستارے میرے پاک دامن پر سجدہ کرنے کو بے قرار ہیں۔ جذبات کے ان سنہرے احساس کے ساتھ ایک تمنا بھی دل کے نہاں خانوں میں آہستہ آہستہ آواز دینے لگی تھی۔ کاش کسی دن شہنائیوں کی سریلی دھن میرے گھر کے آنگن میں بھی گونجے، میں بن سنور کر دلہن بن جاؤں اور ایک سلونا سا نوجوان اپنے ہونٹوں پر پیاری سی مسکان سجائے، سر پر سہرا باندھے میرے در پر مجھے لینے آئے اور میں ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ اس کے گھر چلی جاؤں۔ پھر میری زندگی میں ایک ایسا رنگ بھر جائے کہ تنہائی کی گھڑیاں سہانی راتوں میں تبدیل ہو جائیں۔ میرا ساجن میرا سرخ گھونگھٹ اٹھا کر مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں محصور کر لے۔ میری یہ اچھوتی تمنا وقت گزرنے کے ساتھ شدت سے بیدار ہوتی چلی گئی اور میرے شب و روز اس انتظار میں گزرنے لگے کہ جلد از جلد کوئی آ کر میری جوانی کی تمام نوخیزیاں اپنے پیار کے دامن میں سمیٹ لے۔ میری مستی بھری

انگڑائیوں کا مالک بن کر میری رگ رگ میں تڑپنے والی نو جوانی کی بجلیوں کو حیا آلود پیکر کی شکل دے کر اس کی تمام شوخیاں چرا لے اور میں اپنے خوابوں کے شہزادے کو جوان راتوں کی مدہوشی میں پیار کے جھولے میں تمام شب جھلاتی رہوں، اپنے نرم اور گداز زانو پر اس کا سر رکھ کر اپنے لب ورخسار اور کنوارے جسم کی خوشبو سے اسے مخمور اور بے خود بنا دوں۔ میری یہ خواہش بالکل نہ تھی کہ وہ کوئی دولت مند خوبرو اور اسمارٹ نوجوان ہو۔ میں تو صرف اتنا ہی چاہتی تھی کہ وہ ایک نیک اور شریف انسان ہو۔ اس سے پہلے کہ گزرنے والے ماہ وسال میری شخصیت پر اثر انداز ہونے لگیں، میری اپنی زندگی کی بہاریں خزاں کی نذر ہونے لگیں، میرا تصور، میرا شوہر بن کر مجھے اپنی دنیا بنا لے میں نے تو صرف اتنا ہی چاہا تھا، مگر میرے چاہنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ تقدیر کے کاتب نے تو میری کتاب زندگی میں اس باب کو شامل ہی نہیں کیا تھا جسے شادی کہتے ہیں جس میں ایک ہمدم، مونس وغم خوار شریک سفر ہوتا ہے۔ چنانچہ میری تمام امنگیں اور کنواری آرزوئیں حسرت ناتمام میں تبدیل ہو کر رہ گئیں اور گزرنے والے وقت کے ساتھ چلتے چلتے میں غم کی اڑتالیس منزلیں طے کر گئی۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ وقت نے میری جوانی کی تمام بہاریں چھین کر بڑھاپے کی خزاں آلود وادی میں دھکیل دیا ہے۔ جن دنوں میرے وجود کے اندر جوانی کی بھرپور امنگیں تھیں، مچلتے تڑپتے جذبات تھے، امنگوں کی حسین دنیا تھی اس وقت مجھ میں کمی تھی تو صرف یہ تھی کہ میں ایک ایسے غریب انسان کی بیٹی تھی جس کے پاس جہیز دینے کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے کسی نے مجھے اپنی بیوی اور بہو بنانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اب یہاں کون آئے گا؟ کوئی نہیں۔ آنے والی زندگی کی تنہا اور سنسان ڈگر ہے اور میں نے اپنے دل کا تمام کرب سارا دکھ نوک قلم کے سپرد کر دیا ہے۔ دل کی آگ کو لفظوں کا پیکر دے کر خود اذیتی سے نجات حاصل کر لیا ہے۔ اپنی اس کاوش کے ذریعے زندگی کے وسیع صحرا میں نخلستان کی چھاؤں میں چند منٹ سکون سے گزار لیتی ہوں۔ سوز نہاں کو لفظوں کے سمندر میں ڈبو کر اپنی پیاسی روح کو سیراب کر لیتی

ہوں۔ پاؤں میں کانٹے سے چبھ گئے ہیں۔ راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ سارا جسم چھلنی اور لہولہان ہو گیا ہے۔ فضا میں دھند چھا گئی ہے اور خوابوں کی دنیا کے پٹ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ اب مجھ میں اتنی تاب نہیں ہے کہ دل کے کھنڈر میں آشاؤں کے دیپ جلاؤں۔ آشاؤں کے دیپ تو نہ جانے کب کے بجھ چکے ہیں۔ ان کی راکھ کا بھی اب پتہ نہیں ہے۔ دل کی بستی ایسی اجڑی ہے کہ بسنے کا تصور تک باقی نہیں۔ ان آنکھوں میں سپنوں کی ویرانی نے ہمیشہ کے لئے ڈیرا جما لیا تو میں نے اپنا سارا دکھ، تمام کرب اور دل کی آگ کو نوک قلم کے سپرد کر دیا ہے اپنی اس کاوش کے ذریعے زندگی کے وسیع صحرا میں آبلہ پا نخلستان کی چھاؤں میں چند منٹ سکون سے گزار لیتی ہوں۔ سوز نہاں کو لفظوں کے سمندر میں ڈبو کر اپنی پیاسی روح کو سیراب کر لیتی ہوں۔ شاید اس طرح میں معاشرے کی ان تمام بے بس کنواری لڑکیوں کے جذبات کی ترجمان بن سکوں گی جو جہیز کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتی جا رہی ہیں۔

خودنمائی کی قتل گاہوں پر تھرتھراتی ہے عظمت آدم
جو ہے لعنت معاشرے کے لئے ایسے موضوع پہ تم اٹھاؤ قلم

☆☆☆

گل کے شعلے بھی کبھی آگ لگا دیتے ہیں

انسانی زندگی میں کبھی کبھی ایسے دل خراش واقعات رونما ہو جاتے ہیں جو اس کے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لئے اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ابھی ایک ماہ قبل میں بھی ایک ایسے ہی واقعے سے دوچار ہوگئی ہوں جس کا نقش ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے گردش کرتا رہتا ہے۔ اور ہر لمحہ میرے دل کے اندر تکلیف کا ایک نیا احساس جگا تا رہتا ہے۔ بظاہر ایک بہت ہی معمولی سی یہ بات ہے کہ ایک ماہ قبل میری ملاقات ایک بہت گہری سہیلی سے لمبے عرصے کے بعد اتفاقیہ طور پر ہوگئی تھی۔ مگر اس معمولی سی بات نے ہی مجھے ایک ایسا غیر معمولی کرب عطا کر دیا ہے جو اب شاید مجھے چین سے نہیں رہنے دے گا۔

بات بس اتنی سی ہے کہ ان دنوں گلوکارہ کی حیثیت سے سائقہ حسن کا نام شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ بے شک ان کی درد بھری آواز دلوں کو اس طرح تسخیر کر لیتی تھی کہ جب تک یہ آواز کانوں سے ٹکراتی رہتی وہ اپنا ہوش و حواس کھوئے رہتے۔ جو شہرت ناموری اور عزت سائقہ حسن کے قدم چوم رہی تھی وہ بہت ہی کم کسی کے حصے میں آتی ہے۔ لوگ اس آواز کے دیوانے

تھے کیونکہ اس آواز میں بلا کا سوز پنہاں تھا۔ میں جب بھی ریڈیو پر اس آواز کو سنتی نہ جانے کیوں میرے دل کو یہ احساس ہوتا کہ غم دکھ درد ٹیس اور خون کے آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب جانے کے بعد ہی اس آواز کا جنم ہوا ہوگا۔ میں نے سائقہ حسن کو دیکھا تو نہیں تھا۔ مگر اتنا سنا تھا کہ بڑی سے بڑی تقریب بھی ان کی شرکت کے بغیر ادھوری مانی جاتی تھی۔ لوگ اپنی تقریبات کو کامیاب بنانے کے لئے انہیں منہ مانگی قیمت دینے کو تیار رہتے تھے۔ اپنی اس جادو جگاتی آواز کی بدولت انہوں نے کیا کچھ نہیں پایا تھا۔ وہ جس طرف سے گزر جاتی تھیں ان کے چاہنے والوں کا ایک ہجوم ان پر اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہر دل میں صرف ایک ہی تمنا انگڑائی لے رہی تھی کہ کسی طرح وہ سائقہ حسن کا دیدار اپنی آنکھوں سے کرلے اور ان سے ایک آٹو گراف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ ہر دل کی طرح میری نواسی نائلہ کی بھی یہی تمنا تھی۔ کہتے ہیں کہ جہاں چاہ ہوتی ہے وہیں راہ بھی ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے نائلہ کو یہ موقع ہاتھ آ گیا۔

کرنل دلشاد علی کا شمار اس شہر کے بہت بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ دولت، ثروت اور جاہ وحشمت اس خاندان کی میراث تھے۔ بدلتے ہوئے وقت کی تباہ کاریاں اس خاندان پر اثر انداز نہیں ہوسکی تھیں۔ بلکہ آنے والی نسلوں نے تو اپنے خاندانی وقار اور شان وشوکت کو اور بھی عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اس وجہ سے ان کی عظیم الشان حویلی اب بھی جاگیردارانہ نظام کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس حویلی کی چہل پہل کو دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے سارے جہان کی زندگی ان کے یہاں سمٹ آئی ہو۔ مردوں کے گرج دار قہقہے، عورتوں کی بے فکری اور بچوں کے شوروغل کا نام ان کے یہاں زندگی تھا۔ اتنا ہی نہیں ہر وقت مہمانوں کی کثرت کے درمیان ملازموں کی ایک فوج متحرک رہتی۔ خوشیوں اور مسرتوں سے لبریز اس ماحول کو دیکھ کر ایسا لگتا کہ جیسے غم وکلفت نام کی کسی شے کا اس دنیا میں وجود ہی نہ ہو۔ برآمدے میں بچھے ایک بڑے سے تخت پر دودھ کی سی سفید چاندنی ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر وقت بچھی رہتی تھی جس پر بیگم علی شاندار گاؤ تکیے سے ٹیک

لگائے ملازموں پر حکم چلاتی رہتیں۔

بیگم علی بڑی ہی نیک پرور اور مخلص خاتون ہیں۔ اتنی جاہ و حشمت کے باوجود ان کے اندر تکبر نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ ان کی بڑی لڑکی کو میں نے قرآن شریف ختم کروایا تھا۔ اس کے بعد سے ہی ان سے میری بے تکلفانہ دوستی چلی آرہی ہے۔ ایک دن انہوں نے مجھے بتایا کہ صباحت کی شادی طے پا چکی ہے۔ اس ماہ کی پندرہ تاریخ تک یہ تقریب انجام پا جائے گی۔ اس موقع پر انہوں نے سائقہ حسن کو اپنا پروگرام پیش کرنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ بیگم علی نے میرے کل خاندان کو اس تقریب میں شمولیت کے لئے دعوت نامہ بھیجا تھا۔ نائلہ کو اس شادی کا بہت ہی بے چینی سے انتظار تھا۔ کب وہ تاریخ آئے اور وہ اپنی محبوب فنکارہ کا دیدار کر سکے۔ خدا خدا کر کے وہ تاریخ آ گئی۔ اور میں شمائلہ کے ساتھ بیگم علی کے دولت خانے پر حاضر ہو گئی۔ شادی کا ہنگامہ بڑا ہی بھلا اور رومان پرور لگ رہا تھا۔ باہری گیٹ پر نوجوانوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ اندر عورتوں کی دوڑ دھوپ ایک ایسا حسین منظر پیش کر رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے جگمگاتے ہوئے گوٹے کناری کا ایک میلہ سا لگا ہو۔ چاروں طرف جگمگاتی ہوئی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ نغموں اور موسیقی کی محفل آراستہ ہونے کے لئے بیش قیمت اسٹیج تیار کیا گیا تھا جس کے سامنے اعلیٰ قسم کی کرسیاں اور صوفہ سیٹ ایک لائن میں قرینے سے رکھے گئے تھے۔ جن پر شہر کی معزز ہستیاں جلوہ افروز تھی۔ سائقہ حسن کے علاوہ بھی کئی موسیقار اور گلوکار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ان موسیقاروں کے طرح طرح کے ساز اسٹیج پر رکھے تھے۔ کوئی موسیقار اس حسین ماحول میں اپنا ساز چھیڑتا تو ایسا لگتا کہ جیسے موسیقی کی ایک میٹھی لہر ماحول میں اس طرح گھل مل گئی ہے جیسے ایک بے حد نازک سا احساس کہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں بس گیا ہو۔

طالب علموں اور طالبات کا ایک ہجوم ہاتھوں میں آٹوگراف بک لئے ہوئے سائقہ حسن کی اسٹیج پر آمد کا منتظر تھا۔ جب تمام موسیقار اپنا اپنا بہترین فن پیش کر چکے تو آخر میں سائقہ

حسن اپنے ہونٹوں پر دلکش سی مسکراہٹ لئے اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ انہیں دیکھتے ہی جیسے سیکڑوں دل ایک ساتھ دھڑکنا بھول گئے۔ سائقہ حسن کی عمر رسیدہ شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش تھی۔ بڑی بڑی ذہین آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ اور سر کے سفید بال ان کے تابناک چہرے پر بہت ہی بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ کریم کلر سلک کی ساڑی اور سیاہ بلاؤزان کی کشش کو دوبالا کر رہا تھا۔ کون کہتا ہے کہ بڑھاپے میں انسان کی شخصیت اور اس کی خوبصورتی ماند پڑ جاتی ہے۔ سائقہ حسن کی اس عمر میں بھولی بھالی شخصیت کا مقابلہ شاید کوئی جوان عورت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ انھوں نے ساز چھیڑا اور ان کی مدھر آواز سے فضا مدہوش ہو اٹھی ۔

غم دوراں مرے لمحات کو واپس کر دے
ان تڑپتے ہوئے دن رات کو واپس کر دے
درد اور درد کے جذبات کو واپس کر دے
روشنی چھین لے ظلمات کو واپس کر دے

سائقہ حسن کی شیریں آواز کے جادو میں سامعین کھوئے تھے۔ اور میری نگاہیں سائقہ حسن کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس چہرے کے پیچھے ایک خاموش حکایت چھپی ہو۔ ایک ایسی حکایت جسے صرف میں ہی پڑھ سکتی ہوں اور میں اس چہرے پر وہیں بیٹھے بیٹھے اس حکایت کو پڑھنے لگی۔ اس حکایت کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے دفعتاً ہی میرا ذہن کہیں دور بھٹک گیا۔ شاید ماضی کی وادیوں میں جہاں گزرے ہوئے وقت کے گہرے بہت ہی گہرے نقوش برسات کی رات کے تاروں کی طرح بدلی میں سے نکل کر اچھلے پھر دبکے اور پھر تیزی کے ساتھ چمکنے لگے۔ اور مجھے لگا کہ سائقہ حسن کے عمر رسیدہ چہرے کے پیچھے سے ایک نوعمر لڑکی کی شبیہ ابھر رہی ہے۔ اس شبیہ کے سامنے آتے ہی میری طرف بے شمار یادوں کے کونے سے لپکنے لگے۔ اور اس اسٹیج کی جگہ ایک گرلس کالج کا لان میری نظروں کے سامنے آ گیا جہاں

سنگ مرمر کے پیکر میں ڈھلی ایک بے حد حسین وجمیل لڑکی کالج کی طلباء ساتھیوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی ہے۔ چاروں طرف سے فرمائشوں کا سلسلہ جاری ہے اور وہ لڑکی ہنس ہنس کر انہیں غزلیں اور گیت سنا رہی ہے جسے سن کر ساتھیاں جھوم رہی ہیں، داد دے رہی ہیں اور اس لڑکی کے دل میں سنہرے سپنوں کی جوت جگا رہی ہیں۔ اس لڑکی کی خوبصورتی بے مثال ہے۔ سڈول، پرکشش جسم، آنکھیں دو شراب کے چھلکتے ہوئے جام، اور پھول کی پنکھڑیوں کی مانند پتلے پتلے باریک ہونٹ۔ اس تصویر کو دیکھ کر میرے ذہن کے پردے پر ایک نام آہستہ آہستہ دستک دینے لگا۔ رخسار، رخسار، رخسار ہاں واقعی میں وہ رخسار ہی تھی۔ میری مخلص سہیلی، ساتھ پڑھنے والی، ہر لمحہ ساتھ رہنے والی۔ وقت کی طویل اڑان نے ہم دونوں کو جدا کر دیا اور ہم لوگوں کے خدوخال بھی بدل ڈالے۔ کیونکہ یہ وقت کا تقاضہ ہے جو ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ رونقیں، محفلیں، دکھوں کے اندھیرے اور خوشیوں کی روپہلی کرنیں سب کی سب وقت کی کوکھ میں گم ہو جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے جب بیتے ہوئے دنوں کے تمام مناظر روشن ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت مجھے بھی یہ کامل یقین ہو گیا تھا کہ سامنے بیٹھی یہ عظیم گلوکارہ میری سہیلی رخسار کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ سامعین کے ساتھ نائلہ بھی ان کی آواز کے سحر میں کھو گئی تھی ؎

کوئی آہٹ کوئی آواز مرے پاس نہیں
کاہشِ غم کا کوئی ساز مرے پاس نہیں
کوئی افسانہ کوئی راز مرے پاس نہیں
زیست کا اب کوئی انداز مرے پاس نہیں

موسیقی کا یہ ایسا جادو تھا جو ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ مگر میرے ذہن کے پردے پر تو اس گزرے ہوئے ماضی کی تصویریں متحرک ہو چکی تھیں جو پیچھے بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ سال دو سال نہیں پورے پچاس۔ سال ان برسوں میں نہ جانے کیسے کیسے واقعات اوراق پارینہ بن

گئے۔ ان میں ہی ایک یاد رخسار کی تھی، جو آج اچانک ہی زندگی کے اس موڑ پر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ رخسار میری مخلص سہیلی جس کی زندگی اس شعر کی تشریح بن گئی تھی ۔

آشیاں پھول کی ٹہنی پہ بنانے والے
گل کے شعلے بھی کبھی آگ لگا دیتے ہیں

یہ ان دنوں کی بات ہے جب لڑکیوں میں تعلیم کا رواج عام نہیں تھا۔ پھر بھی ہم دونوں کے والدین نے میٹرک کے بعد ہمارا داخلہ کالج میں کروا دیا تھا۔ اس سال کالج میں شعر و شاعری کا سالانہ فنکشن ہوا تھا۔ رخسار کو شعر و شاعری سے بہت دلچسپی تھی۔ اس لئے اس نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ کوئی انعام بھی رکھا گیا تھا۔ اس روز یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بمبئی کے سہیل کالج سے کوئی نوجوان شاعر بھی اس مقابلے میں حصہ لینے کے لئے آ رہا ہے۔ مگر یہاں سبھی کو یہ یقین تھا کہ رخسار سے بازی کہاں جیت پائے گا۔ پھر بھی ہم سب اس شاعر کو دیکھنے اور سننے کے مشتاق تھے۔ مقابلے کے دن رخسار اسٹیج پر اپنی غزل سنا رہی تھی۔ اسی وقت اس شاعر کے آنے کا اعلان ہوا۔ رخسار غزل گاتے ہوئے سامعین سے داد و تحسین وصول کر رہی تھی کہ اس وقت وہ خود کو اسٹیج پر بڑی مشکل سے سنبھال پائی جب اس نے اچانک ہی یہ دیکھا کہ وہ نوجوان شاعر اگلی قطار میں بیٹھا ہوا اس کی غزل کو سنتے ہوئے اس کی طرف بڑے ہی غور سے دیکھ رہا تھا۔ بہت ہی دیدہ زیب اور مسحور کن شخصیت تھی اس کی۔ کالی شیروانی اور تنگ مہری کے پاجامے میں مردانہ حسن اس کی شخصیت پر برس رہا تھا۔ جب وہ اسٹیج پر گیا تھا تو اس نے رخسار کو اپنی مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شعر پڑھا۔

خدا نے نور کے سانچے میں ڈھالا ہے بدن تیرا
تیری آنکھوں سے جو پی لے نشے میں چور ہو جائے

اور پھر جو اس نے شعر کہنے شروع کئے تو تمام اشعار دل میں اترتے چلے گئے۔ سامعین

نے اسے ستائشی جملوں میں نہلا دیا۔ وہ اشعار سنا رہا تھا اور رخسار میرے کان میں چپکے چپکے کہہ رہی تھی ''ریشماں سن۔ وہ نوجوان شاعر ہی میرا آئیڈیل ہے۔ اس کی دلفریب مسکراہٹ میرے خوابوں کی جان ہے۔'' فنکشن ختم ہونے کے بعد میں نے اس سے مل کر اس کے متعلق معلومات حاصل کی اور رخسار سے اسے متعارف کرایا۔ رخسار ان سے ملو۔ یہ ہیں بمبئی کے سہیل کالج کے طالب علم اور مایہ ناز شاعر فراز۔ مگر وہ تو اس نوجوان کی خوبصورتی اور دلکش مسکراہٹ میں اس طرح کھوگئی تھی کہ رسمی سا جملہ بھی ادا نہ کرسکی۔ اس وقت مجھے یہ جاننے میں قطعی دیر نہیں لگی کہ ایک حسین حادثہ ہو چکا ہے۔ اور دونوں ہی کے دل زخمی ہو گئے ہیں۔

اس حادثے کے بعد رخسار کی زندگی جو بدلی تو پھر بدلتی ہی چلی گئی۔ نہ جانے بعض لوگ ایسے کیوں ہوتے ہیں کہ وہ پہلی نظر میں ہی کسی کو دیکھ کر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ بس اب ہمارا ہے۔ یہی حال رخسار کا ہوا۔ اس نے پہلی ملاقات میں ہی فراز کے لئے اپنے دل کے دریچے پوری طرح کھول دیئے۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ وہ فراز کو برسہا برس سے جانتی ہے۔ اس کی شکل میں اسے محبت اور الفت کا فرشتہ مل گیا ہے۔ بس ایک نگاہ حسین کو اس نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ازل سے اس کی منتظر تھی۔ وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب ہستی سمجھ رہی تھی۔ اور اس خیال میں کھوئی تھی کہ اس نے ایک خوبصورت دل فتح کرلیا ہے۔ وہ فراز کو پا کر ساری دنیا کو بھول چکی تھی۔ اس کی اس وارفتگی کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ محبت میں کسی کے لئے جان دے دینا، کسی کا نام بار بار لیتے رہنا، کسی ایک ہی ہستی کے خیال میں ہر لمحہ ڈوبے رہنا کتنا کیف آور اور زندگی بخش لگتا ہوگا۔ فراز نے بتایا تھا کہ وہ اس شہر میں اپنے کسی عزیز کی علالت کی خبر سن کر آیا تھا اور اس کالج کے شاعری کے مقابلے میں اس نے اتفاقیہ حصہ لے لیا تھا۔ اپنے اس عزیز کی علالت میں فراز کو یہاں چار ماہ لگ گئے۔ اس چار ماہ میں رخسار کو اپنی محبت کا آغاز وانجام ابھی پوری طرح سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا کہ اچانک ہی فراز کو بمبئی واپس جانے کا پروگرام بنانا پڑ گیا۔

اسٹیشن پر بمبئی جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ رخسار فراز کو رخصت کرنے آئی تھی۔ رخصت ہوتے وقت فراز نے رخسار کو دلاسہ دیا تھا۔ اپنے رومال سے آنسوؤں کو خشک کر کے اس کے سامنے قسم کھائی تھی کہ بمبئی جانے کے بعد وہ وہاں اپنے خاندان والوں کو راضی کر کے بہت جلد واپس آئے گا اور اس سے شادی کر لے گا۔ رخسار اس کے کاندھے پر سر رکھے بے تحاشہ آنسو بہا رہی تھی اور وہ اس سے کہہ رہا تھا ''رخسار تم میرا آئیڈیل ہو، تمہیں اپنائے بغیر مجھے چین نہیں ملے گا۔ تم میرا انتظار کرنا میں تمہیں لینے ضرور آؤں گا۔''

اور پھر ٹرین فراز کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر رخسار کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ مگر رخسار کی نگاہیں ریل کی پٹریوں پر بدستور ٹکی رہیں۔ جیسے وہ نگاہیں کہنا چاہتی تھیں آپ کے چلے جانے کے بعد میرے پاس اپنا کچھ بھی نہ رہ جائے گا۔ نہ جائیے خدا کے واسطے نہ جائیے۔ جس دن فراز چلا گیا اس دن کے بعد جو رات آئی اس رات اسے شدید کرب رہا۔ اس کا جسم تیز بخار کی شدت سے تپتا رہا اور اس کی جدائی کا احساس اس کی رگ رگ سے لہو نچوڑتا رہا۔ ساری رات وہ اپنی کھلی آنکھوں سے خلاؤں میں کچھ تلاش کرتی رہی۔ شاید رات کی بھیانک تاریکیوں میں اسے کہیں پر نظر آ جائے۔ ایک مسکراتا ہوا ہنستا ہوا روشن پیکر ایک باوقار مردانہ حسن جسے دیکھتے ہی اس کی پیاس بجھ جایا کرتی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ رات رفتہ رفتہ ڈھل گئی۔ وقت گزرنے لگا اور وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کی مسرتیں شوخیاں تبسم سبھی کچھ اس سے روٹھتے چلے گئے۔ وہ گم سم سی اپنے اشکوں کو آنکھوں کے دریچے میں سنبھالے ہوئے روزانہ فراز کے خط کا انتظار کرتی۔ جو اس کے نام کبھی نہیں آیا۔ گزرنے والا ہر دن اس کے دل کو ایک نیا زخم عطا کرتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کی تمام امنگیں تمنائیں اور جذبات جل کر خاکستر ہو گئیں۔ اور وہ رنج والم کی ایک تصویر بن کر رہ گئی۔ فراز کو بھلا دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ والدین کی کوششیں بھی اس کے دل سے فراز کا نام مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اور جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ ایک بے وفا کا انتظار کرتے

کرتے وہ ایک دن خود ختم ہو جائے گی تو انہوں نے اپنے تمام ارمانوں کو جو اس کی ذات سے وابستہ تھیں اس کی ضد کا کفن پہنا کر مایوسیوں کے مقبرے میں سلا دیا اور خود صبر کی چادر اوڑھ لی۔

اس طرح کرب واذیت کے درمیان سے گزرتے ہوئے چار سال بیت گئے۔ تب ہی ایک دن رخسار کے ابو جب اپنے ایک دوست سے مل کر آئے تو انہوں نے کہا کہ ان کے اس دوست کے ذریعے انہیں معلوم ہوا ہے کہ رخسار جس کے انتظار میں اپنی زندگی کے قیمتی لمحات ضائع کر رہی ہے وہ تو اس کا کبھی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ ایک شادی شدہ، بے مروت، ریاکار انسان تھا۔ فرصت کے ان لمحوں میں جن دنوں وہ یہاں مقیم تھا اسے دل بہلانے کا کچھ سامان چاہیے تھا جس کے لئے اسے رخسار جیسی نادان اور محبت کو عطیہ خداوندی سمجھنے والی ناسمجھ لڑکی کا سہارا مل گیا تھا اور وہ ایک فریبی انسان کے جھوٹے وعدوں پر اپنی زندگی کی خوشیاں ہار بیٹھی ہے۔ رخسار نے اپنے ابو کی اس بات کی صداقت سے انکار کر دیا۔ اس کا دل فراز کو بے وفا ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ آخر تھک ہار کر اس کے ابو اسے اپنے ساتھ لے کر بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔

ایک ہفتہ کے بعد جب رخسار بمبئی سے واپس ہوئی تو وہ مکمل طور سے ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔ اس کا وہ پیکر لطیف حسن جو بے شک حسن و جمال کا ایک جیتا جاگتا شاہکار تھا ایک ہی ہفتے میں ہڈیوں کے پنجر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں اشکوں کا ایک سمندر سمیٹے اس نے مجھے بتایا کہ بمبئی پہنچنے کے بعد ابو اسے لے کر اپنے دوست کے رشتے دار کے یہاں گئے جنہوں نے فراز کے متعلق بتایا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ شام کے وقت ایک ٹیکسی ٹھیک کر کے وہ ان کے بتائے ہوئے پتے پر رخسار کو لے کر پہنچ گئے۔ اس وقت شام کا دھندلکا ملگجی اندھیرے میں تبدیل ہونے جا رہا تھا۔ ابو کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے اور مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں اپنے دل کی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹانے کے

لئے ہاتھ آگے بڑھایا مگر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا اور بند دروازے سے چابی والے سوراخ سے اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کی اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں نے اندر جو منظر دیکھا اس نے مجھے جیتے جی جہنم کا دیدار کرا دیا۔ سامنے ہی ایک بڑی سی مسہری پر فراز بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر خون کی سرخیاں دوڑ رہی تھیں۔ اور جسم بھی پہلے کی بہ نسبت کافی بھرا بھرا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک بے حد حسین سی لڑکی اس کے شانے پر سر رکھے اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ہوا خوب کھلکھلا کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس لڑکی کی آنکھوں کے دیئے بھرپور زندگی کی خوشیوں سے روشن تھے۔ وہ کسی نوخیز صبح کی طرح تروتازہ لگ رہی تھی۔ بے حد سڈول جسم اور گھٹاؤں سے سیاہ لمبے لہراتے ہوئے بال۔ جنہیں اس نے ستاروں سے چمچماتے دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ پاس ہی ایک ننھا سا تندرست بچہ کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میرے دل کو ایک زبردست ٹھیس پہنچی کیونکہ چار سالوں کے بعد بھی میرے سینے کے اندر اس کی یادوں کی چنگاری بالکل اسی طرح بھڑک رہی تھی جیسے کہ ابھی کی بات ہو۔ مگر دفعتاً ہی فراز کے تئیں میرے دل کے اندر نفرت کا ایک شعلہ بھڑکا۔ اور اسی وقت میری لازوال محبت کا حسین تاج محل زمین بوس ہو گیا۔ نہ جانے کتنے آتش فشاں ایک ساتھ میرے وجود کے اندر جل اٹھے اور پھٹ پڑنے کو بے تاب ہو گئے اور مجھے یہ احساس کچوکے لگانے لگا کہ میں نے اپنے والدین سے بغاوت کر کے ایک بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ابو ٹھیک ہی کہا کرتے تھے۔

''بیٹی محبت کا جذبہ ایک وقتی سیلاب سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ سیلاب آتا ہے تو بڑے ہی جوش وخروش کے ساتھ اور جب جاتا ہے تو اپنے پیچھے پچھتاوے اور پشیمانی کی لاتعداد گندگیاں چھوڑ کر جاتا ہے۔'' چنانچہ میں شرمساری دکھی ہو کر اپنا ٹوٹا دل لئے ابو کے ساتھ اسٹیشن واپس لوٹ آئی اور راستے بھر سوچتی رہی کہ میں نے فراز کو اپنے سارے جذبوں اور محسوسات کا مرکز بنا کر ایک کبھی نہ ختم ہونے والا دکھ مول لے لیا ہے۔ نہ جانے کیسے طے ہوگا دکھوں سے بھرا

ہوا زندگی کا یہ طویل سفر۔ اس وقت مجھے اس اندھیرے میں سہارے کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی اور میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ قدرت نے مجھے جو آواز کی دولت عطا کی ہے وہ میری دکھ بھری راہ حیات میں اس غم کو کم کرنے میں میری مددگار ہوگی۔

اس واقعے کے پندرہ دنوں کے بعد ہی اس کے ابو نے ایک ہونہار لڑکے سے اس کی شادی کردی۔ اور رخسار اپنی مانگ میں افشاں سجا کر سرخ جوڑے میں لپٹی ہوئی زندگی کے ایک نئے سفر پر روانہ ہوگئی۔ رخصتی کے وقت وہ مجھ سے لپٹ کر اس طرح روئی کہ ایسا لگ رہا تھا جیسے آج کے بعد وہ دوبارہ کبھی نہیں روسکے گی۔ اس کی آنکھوں سے اشکوں کا ایک سیل رواں بہہ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اس سیلاب میں اس کا سارا دکھ سارا کرب بہہ گیا ہوگا۔

رخسار کی شادی کے ایک سال بعد میری بھی شادی ہوگئی۔ میں جب تک کنواری تھی تب تک میری خط و کتابت رخسار کے ساتھ جاری رہی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ کم ہوتے ہوتے بالکل ہی منقطع ہوگیا۔ غالباً اب اپنی گرہستی کی دنیا میں کھو کر وہ بالکل ہی بھول گئی کہ کبھی اس شہر میں اس کی عزیز ترین سہیلی بھی رہتی تھی۔ سروس کے سلسلے میں تیس سالوں تک ادھر ادھر کا چکر کاٹنے کے بعد جب میرے شوہر ریٹائر ہوگئے تو ہم نے اس شہر میں اپنا ذاتی مکان بنالیا اور مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کرلی۔ وقت کے چکر نے ہم لوگوں کو ڈھیر سارے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں سے نواز دیا۔

اپنی جگہ خاموش منجمد سی بیٹھی ہوئی میں ماضی کی پرچھائیوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی کہ اچانک ہی سامعین کی زوردار تالیوں کی آواز سے میری محویت ٹوٹ گئی۔ میں ماضی کی دنیا کو چھوڑ کر حال کی دنیا میں واپس آگئی اور دیکھا کہ سائقہ حسن جو یقیناً ہی ماضی کی رخسار تھی اپنا پروگرام ختم کرنے کے بعد زیر لب تبسم کے ساتھ اسٹیج سے نیچے اتر رہی تھیں۔ ان کے ارد گرد آٹو گراف لینے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ اور وہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے تمام مداحوں کو آٹو گراف دے رہی

تھیں۔ تب ہی میں ہجوم کو ہٹاتی ہوئی بے ساختہ ان کے بالکل قریب چلی گئی اور اچانک ہی انہیں رخسار کہہ کر مخاطب کر دیا۔ اس نام پر وہ بری طرح چونکیں۔ پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ میں ان کی طرف مسکرا کر دیکھ رہی تھی اور ان کی متجسس نگاہیں میرے چہرے پر اس طرح ٹکی تھیں جیسے وہ کوئی بھولی بسری ہوئی داستان پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں نے انہیں حیران دیکھ کر ان سے ایک سوال کیا۔

''کیا آپ اس شہر میں کبھی اپنے والدین کے ساتھ رہا کرتی تھیں؟''

انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا ''جی ہاں برسوں پہلے، یعنی لگ بھگ پچاس سال قبل میرے والدین اس شہر میں بستے تھے۔ اس وقت میں کالج میں پڑھا کرتی تھی۔ مگر معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' میں نے ان سے اور قریب ہوتے ہوئے اس طرح اپنا تعارف کرایا ''جی میں ریشماں ہوں، آپ کی ان دنوں کی بہت ہی گہری سہیلی'' اتنا سنتے ہی ان کے چہرے پر ایک پرچھائیں سی لہرائی۔ اور انہوں نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکال کر میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔

''اس کارڈ میں میرا یہاں کا ایڈریس ہے۔ میری گزارش ہے کہ کل شام اس پتے پر آپ مجھ سے تنہائی میں ملیں۔ میں کل شام تک اسی شہر میں رہوں گی۔''

تقریب سے واپس آنے کے بعد جب میں رات کو اپنے بستر پر سونے کی غرض سے گئی تب بھی گئی رات تک کے گزرے ہوئے ماضی کے انگنت جگنو میری پلکوں پر چمکتے رہے۔ بہر حال یادوں کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے آخر کار صبح نمودار ہوگئی۔ اور میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد رخسار کے ایڈریس پر اس سے ملنے کے لئے چل پڑی۔ وہ اس شہر کے سب سے بڑے ہوٹل ''گرے'' میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے اس کے روم کی کال بیل بجائی۔ دروازہ کھلا اور رخسار نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ کمرے کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے مجھے سامنے

رکھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس پر بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ چمکیلے بارڈر کی سفید ساڑی میں اور سفید بلاؤز میں ملبوس تھی اور پاؤں میں کالی چپل پہنے تھی۔ اس کے سفید بال کھلے تھے اور پیشانی پر جھک آئے تھے۔ عمر کی اس منزل نے اس کی پروقار شخصیت کو ایک عجیب وغریب نکھار عطا کر دیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچان چکے تھے۔ اور پھر باتوں کا جو سلسلہ چلا تو چلتا ہی گیا۔ باتوں کے اس سلسلے کے درمیان ہی اس نے نظریں جھکا کر مجھ سے آہستگی کے ساتھ ایک سوال کر ڈالا۔

''ریشماں کیا وہ تم سے بھی کبھی ملا؟'' اور میں اس کے اس سوال پر بری طرح چونک پڑی۔ یہ رخسار کس کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ اور میں نے خود اس سے ہی سوال کر ڈالا ''کون؟'' میرا یہ سوال سن کر اس کے چہرے پر کسی نئی نویلی دلہن کی طرح شرم کی لالی بکھر گئی اور اس نے بڑے ہی مدھم لہجے میں کہا ''وہی بمبئی والا شاعر فراز'' یہ سنتے ہی میرا پورا وجود دہل اٹھا اور لگا کہ جیسے سر پر برق سی گر پڑی ہو۔ رخسار کی اس وقت چار بیٹیاں ہیں۔ دو بیٹے ہیں جن کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اس کے شوہر اپنے شہر کے ایک بہت بڑے بزنس مین ایک معزز شہری ہیں۔ رخسار اس وقت ملک کی سب سے بڑی کامیاب گلوکارہ ہے۔ اس کے بیٹے اور بیٹیوں کے بچوں کی بھی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ بھی بچوں والے ہو گئے ہیں۔ مگر محبت میں ناکامی کا یہ بیج جو سینے کے اندر دفن تو ہو جاتا ہے مگر مرتا نہیں وہی بیج عمر کی اس منزل پر بھی پہنچ کر رخسار کے دل کو تڑپا رہا تھا۔ فراز نے رخسار کو دھوکا دیا تھا۔ پھر بھی پچاس سالوں کے بعد زندگی میں سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود اس کی یادوں کی چنگاری اس کے دل کے اندر کہیں نہ کہیں پر سلگ رہی تھی۔ جس کی تپش نے ہی اس کے نغموں کو درد کی ایک لازوال دولت عطا کر دی تھی۔ میں اسے کس طرح بتاتی کہ وہ مجھے کبھی نہیں ملا، کہیں نہیں ملا۔ اگر ملتا تو شاید میں اس سے ضرور پوچھتی کہ ایک حساس اور معصوم لڑکی کے دل سے کھیلنے کا اسے کیا حق تھا۔ میں نے رخسار کے چہرے کی طرف

دیکھا اس کی آنکھیں نمناک تھیں اور وہ کہہ رہی تھی ''ریشماں جب میری شادی اشفاق سے ہوگئی تو پھر میرے لئے زندگی زندگی نہیں رہ گئی۔ صرف شب و روز کا ایک سلسلہ تھا جو چلتا رہا چلتا رہا۔ سال فطرت کا سینہ چیر چیر کر موسموں کو تبدیل کرتے رہے۔ کلیاں کھل کھل کر پھول بنتی رہیں مگر وہ میرے لئے نقیب بہار نہ بن سکیں۔ میں نے اپنے دل کے سارے درد کو نغموں کے پیکر میں ڈھال دیا۔ میرے شوہر اسے میری ترقی سمجھ کر قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ مگر ان کی پر شوق نگاہیں کبھی بھی میرے دل کو گرما نہ سکیں۔ میں ان کے ساتھ صرف جیتی رہی ہوں اور اس وقت تک جیتی رہوں گی جب تک یہ ساز ہستی بے صدا نہیں ہو جاتا۔ جس کے بعد رخسار نے مجھے بتایا کہ وہ آج ہی اس شہر سے واپس جا رہی ہے۔ اس سے رخصت ہو کر جب میں اپنے گھر واپس آئی تو دیکھا نائلہ ٹیپ ریکارڈر پر کیسٹ کے ذریعے سائقہ حسن کی آواز میں فیض احمد فیض کی غزل سن کر جھوم رہی ہے۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

میں نے نائلہ سے کچھ نہیں کہا مگر میرے دل کے اندر سے درد کی ایک ایسی ٹیس اٹھی جو شاید اب کبھی کم نہ ہو سکے گی۔

☆☆☆

ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

صبح صادق کی سنہری کرنوں نے درودیوار پر اٹکھیلیاں کرنی شروع کردی تھیں۔ زہرہ کی ساس نماز صبح سے فارغ ہو کر تھکے تھکے قدموں سے باورچی خانے کے اندر چلی گئیں۔ مگر زہرہ اپنی سوجی ہوئی آنکھیں لئے بالکل افسردہ اور ملول خاموش برآمدے کے تخت پر بیٹھی رہی۔ ابھی کچھ دیر قبل اُس کی ساس نے اس سے چائے کی فرمائش کی تھی تو وہ قہر و غضب کی ایک تصویر بن کر اُن پر برس پڑی تھی۔ مگر ساس نے بہو کی اُن کڑوی کسیلی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور خود ہی چائے بنانے کے لئے باورچی خانے کے اندر چلی گئیں۔ چائے پینے کے بعد انہوں نے ناشتہ تیار کر کے اپنے پوتے ریحان کو کھلایا، اور زہرہ کا ناشتہ بڑے ہی پیار کے ساتھ اُس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ مگر زہرہ نے ناشتہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اور خالی خالی نظروں سے یونہی خلاؤں میں گھورتی رہی۔

زہرہ کی بوڑھی ساس بہو کے درد و کرب اور زخم و اندوہ سے واقف تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ جب اس کا ذہنی اضطراب حد سے بڑھ جاتا ہے تو کھانا پینا اس کے لئے حرام ہو جاتا ہے۔ زہرہ کے

دردوغم کے لئے اُن کے پاس سوائے ممتا کی چھاؤں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ اُن کی اپنی اولاد کی نافرمانی دوسرے کی اولاد کی زندگی کے لئے گھُن بن چکی تھی۔ مگر وہ خود لاچار و مجبور تھیں۔ ان کی اکلوتی بہو زہرہ حسن سیرت اور صورت کا شاہکار تھی۔ مگر اس کی تمام خوبیاں مل کر بھی اسے اس آفتِ ناگہانی سے نہ بچاسکیں، جو اچانک ہی اس کے مقدر پر رات کی سیاہی بن کر چھا چکی تھی۔

زہرہ کے شوہر انور کی بیوفائی نے زہرہ کے پورے وجود کو جھلسا کر رکھ دیا تھا............

اس کی زخمی روح تڑپ اٹھی تھی اور اس کی ہنستی مسکراتی پانچ سالہ ازدواجی زندگی غم کے بگولوں میں کھو گئی تھی۔ انور کی دوسری شادی زہرہ کے گھر کے لئے ایک ایسا طوفان ثابت ہوئی جس نے اس کی تمام خوشیوں کو خاک کے ذروں کی مانند بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

زہرہ سے انور کی شادی یونیورسٹی کی وہ مختصر سی ملاقات کا نتیجہ تھی، جس میں انہوں نے ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کی تھی۔ یہ دل کا معاملہ تھا جو بے حد نازک ہوا کرتا ہے۔ ہر طرح کی قید و بند سے آزاد۔ یہ وقت کے اچھوتے لمحوں کی دین تھی، جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر زہرہ انور کے دامن سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گئی تھی۔ مگر خوشیوں بھری ازدواجی زندگی کی یہ ساعت بہت ہی مختصر تھی۔ یعنی صرف پانچ سال۔ یہ پانچ سال گزرنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک ہی اس کی زندگی میں ایک ایسا بھونچال آ گیا کہ گزشتہ خوشیوں بھرا پانچ سال کا سنہرا ازدواجی سفر اس کے لئے محض ایک خواب بن کر رہ گیا۔ اس کے اس سبز و شاداب چمن پر اس کی اپنی سہیلی سلمیٰ کی نظر بجلی بن کر گری اور اس میں ایک آگ سلگ اٹھی۔ اس آگ سے جھلسی ہوئی اس کی زخمی روح تڑپ تڑپ کر خارزاروں میں بھٹکنے لگی۔ اس کے جوان دل کے سارے ولولے، امنگیں، اور خواہشیں اس سنگین آتش کدہ میں جل کر خاک ہو گئیں۔ خوشیوں کی تمناؤں سے معمور دل مایوسیوں کی نذر ہو گیا، اور اس طرح اس کا پورا وجود جیسے راکھ کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ حالات کی ان تلخیوں نے زہرہ کو ایک حد تک ترش مزاج بنا دیا تھا۔ اس لئے کہ حالات ہی انسان کو ترش مزاج یا

پاگل بنایا کرتے ہیں۔ محرومیوں کی کثرت اور ناکامیوں کی شدت سے ہی مجبور ہو کر انسان زندگی سے فرار کی خواہش اختیار کرتا ہے۔ مصائب والم کے بے پناہ ہجوم میں زہرہ کے دل کی کسک اور جلن کو ساس کی ممتا کی شبنم بھی ٹھنڈک نہ پہنچا سکی۔

سلمیٰ بھی زہرہ کی بہت ہی عزیز ترین سہیلی تھی۔ وہ شادی کے صرف دو ہی سال بعد اپنے شوہر سے طلاق لے کر الگ ہو گئی تھی۔ ریحان کی زچگی کے موقعہ پر زہرہ کی ساس بہت ہی سخت بیمار پڑ گئی تھیں۔ اس موقعہ پر زہرہ کو ایک ایسی عورت کی شدید ضرورت تھی جو پوری توجہ کے ساتھ اس کی اور اس کی ساس کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس موقع پر اس نے سلمیٰ کو خط لکھ کر اپنے پاس بلا لیا۔ یہ قسمت کی بات تھی کہ زچگی کے فوراً ہی بعد زہرہ کی صحت بھی کچھ اس طرح خراب ہوگئی، کہ اسے بحال ہونے میں ایک عرصہ لگ گیا۔ ان ہی دنوں ایسے نازک وقت میں جب زہرہ اپنی صحت سے مایوس، موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی، سلمیٰ کی پر شباب قربت نے انور کے دل کے اندر زہرہ کی کشش پر دوری کی ایک چادر سی تان دی۔

تنہائی کے عالم نے انور کو سلمیٰ سے بہت ہی قریب کر دیا۔ اسی قربت کا سہارا لے کر اس نے ایک رات، جب اس پر جذبات کی شدت طاری تھی، اس نے سلمیٰ کو جگا کر اس سے ایک کپ چائے کی فرمائش کی۔ سلمیٰ جب اس کے لئے چائے بنا کر لائی تو سفید باریک کپڑے کے اندر سے اس کا ملکوتی حسن چھن چھن کر باہر نکلنے کو بیتاب ہو رہا تھا۔ اس کے سیاہ لمبے بال کسی بل کھاتی ناگن کی طرح اس کے دوپٹے سے باہر نکل نکل کر لہرا رہے تھے۔ اور اس کی بڑی بڑی شہابی آنکھیں، جن میں ہمیشہ ایک خمار بھرا رہتا تھا، وہ انور سے ایک خاموش حکایت کہہ رہے تھے؟ اور پھر اسی لمحہ سلمیٰ کی اداؤں نے انور کے سلگتے ہوئے جذبات میں اک آگ سی بھڑکا دی۔ وہ دیوانہ وار سلمیٰ کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے آگے بڑھنے لگا۔ مگر سلمیٰ نے اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو بڑی سختی کے ساتھ روک دیا۔ اور پر سکون لہجے میں اس سے کہا۔

''انور صاحب! سلمیٰ کا جسم اتنا سستا نہیں ہے کہ آپ گناہ کے راستے سے ہو کر اس تک پہنچ جائیں۔ اس لئے کہ گناہ کا مکروہ راستہ میں نے اپنے لئے کبھی پسند نہیں کیا۔ اگر آپ کو واقعی میری چاہت ہے تو آپ سیدھے راستے سے چل کر میرے پاس آیئے۔ میں اس کے لئے تیار ہوں۔''

وقت کا نہ جانے وہ ایسا کونسا کمزور لمحہ تھا جس سے سلمیٰ نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دوسرے دن کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی اور کورٹ میرج کے بعد سلمیٰ بہت ہی اطمینان کے ساتھ انور کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

شب کی سیاہ چادر جب کائنات پر پھیل جاتی تو ایک ہی گھر میں جہاں ایک طرف زہرہ نقاہت اور غنودگی کے عالم میں بیہوش پڑی رہتی، وہیں دوسری طرف انور ایک ایسی جنت کی سیر میں مگن رہتا جس کی پرفریب وادی اسے چاروں طرف سے اپنے جال میں جکڑتی جا رہی تھی۔ زہرہ کی صحت جب کچھ بحال ہوئی تو اس پر بھیانک انکشاف ہوا کہ انور اب اس کی زندگی سے بہت دور جا چکا ہے۔

وقت گزرنے لگا اور وقت کے ساتھ زہرہ اس بھری دنیا میں اپنی بوڑھی ساس اور معصوم بیٹے ریحان کے ساتھ بے چارگی اور کس مپرسی کی زندگی کاٹتی رہی۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی مگر ریحان کے پاس ایک پرانا سوئٹر تک نہ تھا۔ محرومی اور کم مائیگی کے اس احساس نے آج زہرہ کی بھوک، پیاس حرام کر دی تھی۔ رفتہ رفتہ دن کا اجالا ختم ہو گیا اور شام کے سائے در و دیوار پر پھیلنے لگے، مگر وہ گم سم اسی جگہ بیٹھی رہی۔ آنکھوں سے لگاتار بہنے والے آنسو گالوں پر خشک ہو چکے تھے۔ ساس نے انتھک کوشش کی کہ وہ کم از کم دو چار لقمہ کھائے مگر ان کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ بالآخر کائنات پر جب تیرگی کا علم لہرانے لگا تو وہ نڈھال قدموں سے چلتی ہوئی اپنے بستر پر جا کر گر گئی۔ بستر پر گرتے ہی اس کے زخموں کے تمام ٹانکے ایک بار اور کھل گئے اور وہ تڑپ تڑپ کر اپنے ارد گرد انور کی ان گداز بانہوں کے حصار کو تلاش کرتی رہی جو پانچ سالوں تک اس کے نرم و نازک

وجود کو سمیٹتے رہے تھے۔ تڑپ اور چبھن کے درمیان ہی اچانک اسے یہ احساس ہوا کہ وہ بانہیں تو اب اس کے گرد اپنا حصار توڑ چکی ہیں۔ بے بسی کے عالم میں اس نے معصوم ریحان کو اپنے کلیجے سے بھینچ لیا، جو مدھم سی روشنی میں ماں کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ماں کے بے حد اداس اور غمگین چہرے کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک معصوم سی خلش جاگ رہی تھی۔ 'میری امی، اتنی دکھی کیوں رہتی ہیں؟''

اس سوال کی خلش سے بے چین ہو کر اس نے اپنی ممی سے آخر ایک سوال کر ہی ڈالا۔

''امی! میرے ابو آخر یہاں کیوں نہیں آتے ہیں؟'' بیٹے کی زبان سے ایسا سوال سن کر زہرہ کی نگاہوں میں درد و کرب کے سائے لہرا گئے۔ جنھیں دیکھ کر ریحان اپنے سوال پر خود بخود شرمندہ سا ہو گیا...... مگر زہرہ نے اسے جواب دیا۔

''بیٹا! ایک کالی ناگن نے تمہارے ابو کو ہم لوگوں سے جدا کر دیا۔''

ماں کے اس جواب سے ریحان کے ننھے سے دل کی خلش کم تو نہ ہو سکی مگر وہ اس کا دھیان بٹانے کے لئے اس سے کہانی کی فرمائش کرنے لگا...... زہرہ نے دل کے سکون کے لئے اسے پریوں کے دیس کے اس راجہ کی کہانی سنائی جو راجکماری کو بڑے ہی ارمان کے ساتھ چاندی کے رتھ پر بٹھا کر لے گیا تھا اور پھر اسے وہاں ایک تاریک قید خانے میں قید کر دیا تھا۔ وہاں وہ بدنصیب راجکماری اپنے راجہ کی ایک جھلک دیکھنے کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی پتھر کی ہو گئی تھی۔ یہ کہانی سن کر ریحان یہ سوچتے سوچتے سو گیا کہ نہ جانے اس ظالم راجہ نے اس بے چاری راجکماری کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیوں کیا؟

وقت کو گزرنا ہوتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ گزرنے لگا، اور گزرتے وقت کے ساتھ زہرہ کا وجود بھی اپنے غم کی آنچ میں پگھلتا رہا۔ اس کے دکھے دل کا اگر کوئی سہارا تھا تو وہ تھا اس کا بیٹا ریحان، جسے زندگی کی کلفتوں نے وقت کی آگ میں تپا کر کندن بنا دیا تھا۔ اسے اعلیٰ تعلیم کا بے حد شوق تھا اور بیٹے کی

یہ دلی تمنا ہی زہرہ کا مقصد حیات بن گئی۔ اپنے اس مقصد کو لے کر وہ اپنی امیدوں کے ریگستان میں بھٹکنے لگی۔ اگر چہ اس کے ارادوں کے پاؤں لہولہان ہوتے رہے۔ اعتماد کی شمعیں پگھل پگھل کر دم توڑتی رہیں اور احساسات کا جسم ناموافق، حالات کے تیز نیزوں سے چھلنی ہوتا رہا۔ مگر اس کے مضبوط اور توانا ارادوں کے سہارے اس کے قدم نہیں ڈگمائے۔ وہ اپنی منزل کی جستجو میں رواں دواں رہی۔ اسے یہ احساس تھا کہ اس کا تابناک مستقبل اسے کہیں دور سے آواز دے رہا ہے۔ اس کے جہیز کے تمام زیور آہستہ آہستہ بکے اور ریحان کی جان توڑ محنت نے اسے اس کا صلہ عطا کیا۔ اس نے انجینیئرنگ کی ڈگری حاصل کر کے ایک اعلیٰ مقام پالیا..... زہرہ کی خزاں رسیدہ زندگی کا وہ ننھا سا پودا جس کی آبیاری اس نے اپنے خون جگر سے کی تھی وہ اس کے لئے ایک تناور آرام دہ اور سایہ دار درخت بن گیا۔ اس کی زندگی میں ہر طرف چھائے ہوئے اس گھور اندھیارے میں ریحان کی کامیابی کا آفتاب پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگانے لگا۔ غم والم کی وہ سیاہ چادر جو کبھی ایک نحوست بن کر اس کے وجود پر سایہ فگن ہوگئی تھی۔ وہ کہیں بہت دور سرک گئی اور اس کے گھر پر اب ایک نئی سحر مسکرانے لگی..... زہرہ کی آنکھوں نے بیٹے کے سر پر ممتا کے انمول موتی نچھاور کئے اور اسے لگا کہ اس کی بے چین زندگی کو جس سکون کی تلاش تھی وہ اسے حاصل ہوگیا۔ اس لازوال سکون کے بعد شوہر کی بے وفائی اس کے لئے ایک بھولی بسری کہانی بن گئی۔ اور وہ خود اس شعر کی تفسیر بن گئی۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

☆☆☆

گھر کا چراغ

گرمی کی تپتی ہوئی دوپہر میں ڈاکٹر صفیہ کی چھوٹی سی فی ایٹ کار اس کے بنگلے کے اندر داخل ہوئی۔ کار سے اتر کر ڈاکٹر صفیہ جب اپنے گھر کے اندر داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اندر چاروں طرف سناٹے کی حکمرانی تھی۔ شاید دھوپ کی تمازت سے محفوظ رہنے کے لیے بھی اپنے اپنے کمروں کے اندر بند تھے۔ ڈیوٹی سے لوٹی ہوئی تھکی ہاری ڈاکٹر نے کمرے کے اندر جا کر جب چاروں طرف اپنی نظریں دوڑائی تو دیکھا کہ اس کا چھوٹا بھائی عمران اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف ہے اور چھوٹی بہن شاذیہ کشیدہ کاڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹر صفیہ نے اپنا اسٹیتھ اسکوپ ٹیبل پر رکھا اور سفید کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ اس کمرے میں امی کو نہ دیکھ کر وہ انہیں آوازیں دینے لگی۔ تب ہی شاذیہ نے اپنا ٹیبل کلاتھ الگ رکھتے ہوئے کہا ''آپا امی کی طبیعت آج صبح سے کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اپنے کمرے میں سوئی ہیں۔ آپ ہاتھ دھولیں، میں آپ کے لیے کھانا لگواتی ہوں۔''

امی کی طبیعت ناساز ہے۔ یہ سنتے ہی صفیہ کے چہرے پر تفکر کی بہت ساری لکیریں

ایک ساتھ ابھر آئیں اور وہ جلدی سے امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ امی اپنے بے حد صاف و شفاف سفید بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ صفیہ نے ان پر جھکتے ہوئے آہستہ سے آواز دی۔ 'امی' آواز سن کر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور صفیہ کو متفکر چہرے کے ساتھ اپنے پاس دیکھ کر گویا ان کے چاروں طرف مسرت اور شادمانی کی روشنیاں ہی روشنیاں بکھر گئیں۔ انہوں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا ''بیٹی آج وقت سے پہلے ہی آ گئیں؟'' صفیہ نے جواب دیا ''ممی آج کلینک میں ایک ہی ایمر جنسی آپریشن تھا۔ اس سے فارغ ہو کر چلی آئی۔ شاذیہ سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ لائیے پہلے آپ کا چیک اپ کر لوں۔'' امی کا چیک اپ کر کے اور ضروری دوائیں دے کر وہ کھانا کھانے چلی گئی۔ آج کے آپریشن کے بعد وہ کافی تھک گئی تھی۔ اس لیے فریج سے ٹھنڈے پانی کا گلاس پی کر سونے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ڈاکٹر صفیہ جب اپنے کمرے میں آئی تو غیر ارادی طور پر اس وقت اس کی نظریں سامنے الماری میں لگے قد آدم آئینے پر ٹک گئیں۔ آئینے میں اس کا مکمل سراپا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک بھر پور نظر اپنے سراپے پر ڈالی اور جیسے آج پہلی مرتبہ کچھ محسوس کر کے وہ چونک پڑی۔ اس نے آئینے میں دیکھا کہ گزرتے وقت نے اس کی جوانی کی تمام بہاریں اپنے دامن میں سمیٹ لی تھیں۔ صرف عہد ماضی کی دھندلی سی ایک حسین تصویر کا عکس ہی اس کے وجود سے لپٹا رہ گیا تھا۔ وہ موتیا موتیا سی ایک باوقار خاتون بن گئی تھی۔ لمبے، سیاہ گھونگھریالے بال مختصر ہو کر ایک ربر بند میں قید ہو گئے تھے اور بڑی بڑی سیاہ شربتی آنکھوں کو سنہرے فریم کے چشمے نے ڈھانک لیا تھا۔ اس کی پوری شخصیت ہی ایک سفید پیکر میں ڈھل چکی تھی اور وہ عمر کی اس منزل میں داخل ہو گئی تھی جہاں شخصیت خود بخود باوقار بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر صفیہ کا نام ملک کی ایک کامیاب سرجن کے طور پر لیا جاتا تھا۔ یہ اعلیٰ مقام اس نے اپنی انتھک محنت، لگن اور جد و جہد سے حاصل کیا تھا اور اب اس کے اپنے گھر کے بھی افراد کی

ذمہ داریاں اس کے سپرد تھیں۔ کچھ دنوں سے اس کی ممی کی صحت تیزی کے ساتھ گرتی چلی جارہی تھی۔ گو وہ بہت ہی تندہی کے ساتھ ان کا علاج کر رہی تھی مگر آج ان کا ذرد ذرد چہرہ دیکھ کر وہ نہ جانے کیوں اندر ہی اندر بکھری گئی اور آئینے کے سامنے سے ہٹ کر نڈھال سی بستر پر دراز ہوگئی اور تھکے تھکے ذہن سے سوچنے لگی۔ آج ہمیں دیکھ کر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کیسے مزے میں ہیں۔ یہ لوگ ہر لمحہ ہر ساعت اپنی خوشی سے گزارتے ہیں۔ نہ کوئی فکر، نہ کوئی غم، لیکن کیا واقعی میں اب ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہوں؟ ذہن کے اس سوال کی کرچی نے اس کے ماضی کی راکھ کو کریدا جس کے سبب اس کے چاروں طرف یادوں کی چنگاریاں سی اڑنے لگیں اور اسے اچانک ہی یاد آگئے اپنے وہ گزشتہ غم، وہ دکھ اور ساتھ ہی خیالات کے کینوس پر ابھر آیا ابو کا روشن چہرہ۔ افسردہ سا دکھی سا، کچھ سمجھاتے ہوئے یادوں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے، دعاؤں کا تحفہ دیتے ہوئے اور پھر خاموشی کے ساتھ دور کہیں خلاؤں میں کھو گیا۔ تب ہی وہ سوچنے لگی اپنے حال کے سفر کے متعلق ہنستے مسکراتے خوبصورت وادی کے درمیان کبھی نہ مرجھانے والے پھولوں کی مانند خوشبو دیتے ہوئے۔ اس نے اپنی اس نئی زندگی کا سفر کسی چمن کی سی تنظیم کے ساتھ شروع کیا تھا۔ بہت ہی ہمت اور جرأت کے ساتھ اپنی زندگی کے اس نئے باغ کی سنگلاخ اور پتھریلی زمین کو اس طرح ہموار کیا تھا کہ اس میں خوش رنگ پھولوں کی آبیاری کی جا سکے۔ اس گلستان کو سینچنے کے لیے اس نے خود اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سکھایا تھا اور اپنے ہاتھوں کی کڑی ریاضت سے چمنستان زندگی میں لالہ وگل کی فصل اگائی تھی۔ اس نے اپنی پیاسی زمین کی پیاس بجھانے کے لیے ایک کوہکن کی طرح پہاڑ کا سینہ چیر کر اس میں سے ٹھنڈے میٹھے پانی کی لہر جاری کی تھی۔ زندگی کے اس حسین سفر کے متعلق سوچتے ہی سوچتے اس کے ذہن کی گہرائیوں سے ایک سوال ابھر آیا۔ آج میرا دامن خالی تو نہیں پھر گزشتہ یادوں کے چراغ میرے دل کی گہرائیوں میں اکثر کیوں جل اٹھتے ہیں؟ کیا میں اذیت پسند ہوں؟

اسے اپنے دل سے اس سوال کا جواب تو نہ ملا مگر اس کا ذہن اسے ماضی کی وادیوں میں گھسیٹ کر لے گیا اور تیس سال قبل کا گزشتہ وقت اس کی نگاہوں کے سامنے آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔

اسے یاد آیا اپنے گھر کا گھٹن بھرا وہ ماحول جب اس کے ابو معمولی سے ایک اسکول ماسٹر تھے۔ اپنے پانچ بھائی بہنوں میں صفیہ سب سے بڑی تھی۔ جب سے اس نے اپنا ہوش سنبھالا تھا۔ گھر میں سکون اور چین کا نام ونشان تک نہ دیکھا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہ جانا تھا کہ گھر کا چین کیا ہوتا ہے۔ صفیہ سے چھوٹا بھائی گوہر غلط سوسائٹی میں پڑ کر تباہ ہو چکا تھا اور اس گھر کو گھر کے چراغ سے ہی آگ لگ رہی تھی۔ وہ ہر دن ابو کے دل پر ایک نیا زخم لگایا کرتا تھا۔ انہوں نے بڑی ہی جانفشانی سے کچھ روپے پس انداز کر کے صفیہ کے لیے کنگن بنوائے تھے۔ ایک دن جو انہوں نے الماری کھولی تو وہ کنگن غائب تھے۔ اسی دن ابو کو پہلا دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ گوہر پندرہ دنوں سے گھر سے غائب تھا۔ صفیہ کا میٹرک کا امتحان تھا اور وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں پڑھ رہی تھی۔ ایک کونے سے امی کے کراہنے کی آواز آئی تو صفیہ نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا مگر صفیہ پر امی کی نظر پڑتے ہی وہ اس پر برس پڑیں۔ ''اری مردار ہر وقت کنگن کے غم میں کتابوں کی آڑ لے کر بیٹھی رہتی ہے۔ موئے دو ٹکے کے کنگن کے آگے بھائی کی محبت کو بھول بیٹھی ہے۔ پندرہ دنوں سے گوہر کا پتہ نہیں ہے اور اسے پڑھائی کی لگن لگی ہے۔ جیسے بیرسٹر بن کر گھر ہی تو سنبھال لے گی۔'' صفیہ نے ملگجے دوپٹے سے آنکھوں سے بہنے والے آنسو پونچھ لیے۔ وہ جانتی تھی کہ گوہر جب بھی گھر سے بھاگتا تھا تو ڈانٹ اسے ہی پڑتی تھی۔ ابو نے مدھم آواز سے کہا ''کیوں پڑھائی میں اسے ڈسٹرب کرتی ہو؟ تمہارے لاڈلے کے تو کرتوت یہی ہیں۔'' اتنا سنتے ہی امی کی سسکیاں پوری شدت کے ساتھ گھر کے اندر گونجنے لگیں۔ ہاں یہ لاڈلی ہی تو پڑھ لکھ کر گھر کو روشن کرے گی۔ ارے کچھ بھی ہو یہ پرائی امانت ہے اور وہ گھر کا چراغ ہے۔

پندرہ دنوں کے بعد گوہر گھر واپس آیا تو امی کی باچھیں کھل گئیں ''بیٹا کہاں چلے

جاتے ہو۔ کچھ کہہ کر جاتے۔ دل پریشان ہو جاتا ہے۔ ارے بیٹا وہ کنگن تو میں نے تمہاری ہی دلہن کے لیے بنوایا تھا۔ اللہ رکھے جب تم کمانے لگو گے تو ایسے ایسے نہ جانے کتنے کنگنوں کا ڈھیر لگا دو گے۔ صفیہ کی پلکوں پر آنے والے آنسو ڈھلکنے سے پہلے ہی آنکھوں کے گوشوں میں اپنا وجود فنا کر گئے۔ اس کے بعد تو گوہر کا یہ معمول بن گیا کہ وہ ہفتہ دس دن پر آتا اور گھر سے جو کچھ بھی ہاتھ لگتا اسے لیکر رفو چکر ہو جاتا۔ اور صفیہ کی زندگی کی ساری پونجی بس اس کے کورس کی کتابیں تھیں۔ مگر امی جب زیادہ غصے میں ہوتیں تو وہ کتابیں بھی اٹھا کر آنگن میں پھینک دیا کرتیں۔ ایک بار گوہر جب ابو کی الماری سے ایک بڑی رقم نکال کرلے گیا تو پورے ایک ماہ لاپتہ رہا اور امی نے اس درمیان پورا گھر سر پر اٹھا رکھا۔ گوہر کے واپس آنے پر ایک دن محلے کی چند عورتیں امی سے ملنے کے لیے آئیں تو باتوں کے دوران انہوں نے گوہر کا حال پوچھا۔ امی کی آنکھیں ان کے سامنے چھلک اٹھیں اور انہوں نے گوہر کا سارا حال بیان کرتے ہوئے الزام ابو پر ڈال دیا۔ تمام باتیں سن کر ایک عورت نے امی کو یہ رائے دی ''اے بہن میری مانو تو کسی خوبصورت سی لڑکی کو دیکھ کر گوہر کی شادی کر دو۔ ہاں بہن شادی کی دلکش زنجیر نے تو نہ جانے کیسے کیسے بگڑے نوابوں کو باندھ دیا ہے۔'' امی کے دماغ میں یہ بات جم گئی۔ انہوں نے پڑوسن عورتوں سے کہا ''بہن میں تو ناامید ہو گئی ہوں۔ کیا گوہر کبھی اپنے گھر بار سے لگے گا؟ اگر آپ لوگوں کی نظر میں کوئی ایسی لڑکی ہو جو گوہر کو باندھ کر رکھ سکے تو مجھے خبر کریں۔ ویسے میرا گوہر دل کا برا نہیں ہے۔ اسے گھر کے اندر پیار ملے گا تو ضرور سنبھل جائے گا۔'' اس گفتگو کے بعد گوہر کی خاطر داریاں اور بھی بڑھ گئیں۔ ابو اس درمیان ریٹائر کر گئے تھے۔ گوہر اس شرط پر شادی کے لیے رضامند ہوا کہ ابو کی پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے وہ کوئی بزنس کرے گا۔ امی نے ابو سے لڑ جھگڑ کر انہیں اس کے لیے بھی راضی کر ہی لیا اور ابو کی پرویڈنٹ فنڈ کی پائی پائی لگا کر گوہر کے لیے چپلوں کی ایک دوکان کھول دی گئی۔ وہ دوکان چلانے لگا اور دوکان بھی اچھی چلنے لگی۔ گوہر سے چھوٹا بھائی عامر اسکول جانے لگا اور

دونوں چھوٹی بہن آسیہ اور شاذیہ بھی گھر میں ماسٹر سے پڑھنے لگیں۔ امی کی باچھیں ہر وقت کھلی رہتی تھیں اور صفیہ کے لیے تب بس اتنا ہی فرق پڑا تھا کہ وہ اسے کتابوں کے درمیان غرق دیکھ کر چیختی چلاتی نہیں تھیں۔

زندگی کی گاڑی سبک رفتاری کے ساتھ چل رہی تھی کہ ایک دن محلے کی صغرا خالہ امی سے ملنے کے لیے آئیں۔ صغرا خالہ محلے کے لڑکے اور لڑکیوں کے رشتے لگانے میں ماہر تھیں۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے گوہر کے متعلق دریافت کیا تو امی نے انہیں خوش ہو کر جواب دیا ''خالہ خدا کا شکر ہے کہ گوہر سنبھل گیا۔ اس کی دوکان اچھی چل رہی ہے۔'' اتنا سن کر صغرا خالہ نے کہا ''بس بہن اب لڑکے کے پاؤں میں جلدی سے بیڑی ڈال دو۔ ورنہ پیسہ ہاتھ میں آنے پر جوان لڑکے کو بھٹکتے دیر نہیں لگتی۔ امی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ''ہاں خالہ کوئی ڈھنگ کی لڑکی بتاؤ تو میں اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔''

صغرا خالہ نے فوراً ہی کہا ''میری نظر میں ایک لڑکی ہے نعمت۔ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ باپ پوسٹ ماسٹر ہے۔ دسویں جماعت میں پڑھتی ہے۔'' امی نے ان سے کہا ''تم بات کر کے دیکھو، اگر وہ لوگ راضی ہوں تو مجھے خبر کرنا۔ صغرا خالہ نے اپنی چادر سر پر رکھی اور سٹر پٹر کرتی ہوئی چلی گئیں۔

ایک ہی ہفتہ کے بعد گھر کے آنگن میں بچھے بڑے سے تخت پر کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ناشتے اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ گوہر کی بات پکی کرنے کے لیے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ صغرا خالہ بھی تھیں۔ صفیہ کے چہرے سے خوشی عیاں تھی اور وہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں پیش پیش تھی۔ انہوں نے گوہر کو دیکھا اور ایک ہفتہ کے بعد جواب دینے کا وعدہ کر کے چلے گئے ابھی ایک ہفتہ گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک دن صغرا خالہ سر پر اپنی مخصوص چادر ڈالے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر آج مزید مسرت کے آثار تھے۔ آتے ہی

انہوں نے صفیہ کی امی کو آواز دی۔ امی صغرا خالہ کی آواز سن کر بدحواسی سے دوڑتی ہوئی آئیں اور ان کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ صغرا خالہ نے امی سے سرگوشیوں بھرے لہجے میں کہا ''بہن مبارک ہو ایک پنتھ اور دو کاج۔ تم بڑی خوش قسمت ہو۔ نعمت کے والدین کا یہ کہنا ہے کہ ہم ایک شرط پر نعمت کی شادی گوہر سے کریں گے۔ وہ یہ کہ اگر وہ لوگ ہمارے بیٹے اقبال سے اپنی بیٹی صفیہ کی شادی کریں۔ انہیں صفیہ بے حد پسند آئی ہے۔'' امی نے اپنی دلی خوشی کو دباتے ہوئے کہا ''میں صفیہ کے ابو سے اس کے متعلق بات کروں گی۔ ویسے میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ اس رشتے کے لیے ضرور راضی ہو جائیں گے۔ ابو نے جب یہ سنا تو وہ بری طرح بکھر گئے کیونکہ انہیں صفیہ کی پڑھائی مکمل کرانے کا بے حد شوق تھا۔ مگر امی نے زندگی میں ابو سے ہمیشہ اپنی ہی منوائی تھی۔ لہٰذا صفیہ کے ابو نے زچ ہو کر حامی بھر لی ''بات پکی کرو اور شادی کی تاریخ مقرر کر لو۔'' دوسرے دن صفیہ باورچی خانے میں توے پر روٹی ڈالتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی کہ اسی وقت آ کر امی نے حکم صادر کر دیا۔ ''کل سے اسکول نہ جانا۔'' اس کے دل کے اندر ایک زوردار چھناکا ہوا اور مستقبل کی ساری روشنیاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ اسے بہت ہی ارمان تھا کہ میٹرک کے بعد وہ ڈاکٹری پڑھتی۔ مگر اس کی یہ تمنا اس کے دل کے اندر گھٹ کر رہ گئی۔

شادی ہو گئی اور صفیہ اقبال کے پیار میں سب کچھ بھولتی چلی گئی۔ اقبال کی سحر انگیز شخصیت نے اسے اسیر کر لیا اور وہ اپنی گرہستی کی دنیا اور شوہر کی محبت میں کھو گئی مگر دوسری طرف قسمت ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد گوہر نے اپنا پرانا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ نعمت رات رات بھر اس کا انتظار کرتی رہتی اور وہ گھر سے غائب رہتا۔ ایک دن نعمت امی کے ساتھ کسی شادی میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ کپڑے بدل کر اس نے بکس کے اندر سے زیوروں کا ڈبہ نکالا اور کھولا تو یہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی کہ ڈبہ بالکل خالی تھا۔ گوہر دس دنوں سے گھر سے لاپتہ تھا۔ ابو کو اس روز دل کا ایسا دوسرا شدید دورہ پڑا کہ وہ دوبارہ گوہر کے

کرتوت دیکھنے کے لیے بستر سے اٹھ نہ سکے۔صفیہ کو اطلاع ملی۔وہ آئی مگر اس وقت تک اس کے سر سے دعاؤں کا سائبان اٹھ چکا تھا۔ چالیسویں کے بعد صفیہ تو دوبارہ اپنے سسرال چلی گئی مگر نعمت گوہر کے انتظار میں دروازے پر آنکھیں بچھائے رہی۔ایک سال کا عرصہ گزر گیا مگر گھر کا چراغ گھر کو روشن کرنے کے لیے واپس نہ آیا اور جب پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گھر کے تنکے تک بک گئے تو ایک دن نعمت اجڑی ہوئی اپنے میکے واپس آ گئی۔نعمت کے جانے کے دوسرے ہی دن رات کے وقت جب محلے میں سناٹے کا راج تھا اور سب گہری نیند میں سو رہے تھے، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ امی نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو مرجھائی مرجھائی سی صفیہ دروازے پر کھڑی تھی۔امی کو دیکھ کر وہ ان کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔امی اقبال نے مجھے طلاق دے دیا ہے۔وہ کچھ دیر تک سسکتی رہی پھر اپنے کمرے میں جا کر کچھ تلاش کرنے لگی۔امی بھی تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے آئیں۔''صفیہ بیٹی کیا تلاش رہی ہو؟'' اپنی کتابیں امی، میں ڈاکٹر بنوں گی۔اپنے زیورات میں اپنے ساتھ لائی ہوں۔'' صفیہ نے پرغم لہجے میں جواب دیا۔امی نے پلٹ کر اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرف دیکھا اور انہیں ایک نئی زندگی کی آس بندھ گئی۔

☆☆☆

جب چوڑی ٹوٹ گئی

چھناک چھناک کی دل خراش آواز سے ماحول میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا تھا۔ ثاقب کھانے کی میز پر سے ناشتے کے تمام برتن اٹھا اٹھا کر زمین پر پھینک رہے تھے اور حجاب میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے بدمزاج شوہر کو ایسا کرنے سے روک سکے۔ نہ جانے ثاقب اسے اپنی شریک حیات نہ سمجھ کر کیا سمجھتے تھے۔ مشین کی بھی اپنی جگہ ایک اہمیت ہوتی ہے۔ مگر اس گھر میں ایک زندہ انسان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ثاقب کو دفتر جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے میں کچن کے اندر جلد از جلد ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ تمام چیزیں ٹرے میں رکھ ہی رہی تھی کہ ثاقب کھانے کی میز کے پاس جا کر سبھی چیزیں اٹھا کر پھینکنے لگے۔ جب بھی وہ ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑے اٹھا کر پھینکتی تو اسے یوں لگتا کہ جیسے اس کی اپنی ہی ذات ثاقب کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہی ہو۔

وہ ناشتہ لے کر تیزی سے کھانے کے کمرے میں آئی مگر ثاقب تو برتن پھینک کر کب کے باہر جا چکے تھے۔ میز کے تمام برتن فرش پر بکھرے پڑے تھے اور حجاب آنکھوں سے نکل آنے

والے آنسوؤں کو روکے خاموشی سے ان کا حشر دیکھ رہی تھی۔ ثاقب کے ابا جنہیں آئے دن گھر میں ہونے والی اس ہنگامہ آرائی سے کوئی مطلب نہیں تھا وہ چائے پینے کے بعد اخبار پڑھنے میں محو تھے۔ آنکھوں میں آنے والے ڈھیر سے آنسوؤں کو اس نے کسی طرح سے روکا اور فرش پر بکھرے برتنوں کے ٹوٹے ٹکڑوں کو سمیٹنے لگی اور انھیں اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ٹکڑوں کو باہر پھینکتے وقت وہ سوچنے لگی کہ یہ ٹوٹنے کا عمل کس قدر تکلیف دہ ہوا کرتا ہے۔ چاہے وہ چیزوں کا ٹوٹنا ہو یا آدمی کی شخصیت کا، جب بھی کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے تو وہ صرف ایک ٹوٹا ہوا ڈھیر بن جاتی ہے۔ جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دینا چاہے وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ کاش مردوں کی یہ دنیا کبھی اس پر بھی غور کرتی کہ عورت کا وقار اس کے حقیقی منصب کا تحفظ مردوں پر فرض ہے۔ برتن سمیٹ کر اس نے قرینے سے الماری میں رکھا اور کمرے میں آکر دریچے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس وقت آسمان میں ہر طرف کالے اجلے بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا اس کی زندگی کی مانند اداس دکھائی دے رہی تھی اور ہوا اس کے حرکت قلب کی طرح تھکی تھکی چل رہ تھی۔ مایوسیوں کا ایک مجسمہ بنی نہ جانے کب تک وہ خلاؤں کو گھورتی رہی۔ خاموش گم سم سی، بیزاری، افسردگی اور محرومی کے احساس نے اسے روہانسا کر دیا۔ پلکوں تک رکے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ کر کے اس کے جلتے ہوئے دماغ پر گر رہے تھے اور ذہن میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کا جائزہ لے رہی تھی اور خود سے باتیں کر رہی تھی۔ آج اس کی شخصیت اس کی اپنی ہی نظروں میں عجیب وغریب بن کر رہ گئی تھی۔ ایک وقت ایسا تھا جب اسے اپنی شخصیت پر ناز تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ متوسط قد، روشن جبیں، گویا چودھویں کا چاند، کمان کی طرح تنی ہوئی بھویں، مچھلی جیسی آنکھیں، پتلے پتلے گلابی نازک سے ہونٹ جیسے شہد میں بھگوئے ہوئے ہوں، صراحی دار گردن اور پنڈلیوں تک چھائی ہوئی کالی گھٹا جیسے بال۔ اس نے کبھی کسی کی نازیبا بات برداشت نہیں کی تھی۔ اگر کوئی اس کے روبرو خلاف مزاج بات کرنا چاہتا تو اس کی بارعب ہستی کے سامنے اس کی زبان ہی نہیں کھل پاتی تھی۔

جب اس نے ایک چھوٹے سے ویران نما مکان میں قدم رکھا تو اپنی مغموم آنکھوں سے وہاں کچھ ڈھونڈنا چاہا۔ اپنی ایک پاکیزہ تمنا ایک انمول خواہش مذہبی اصولوں کی چاہت اور وابستگی، مگر اس کی متلاشی نگاہیں گھر کے حدود اربعہ سے ٹکرا کر واپس لوٹ آئیں۔ اس گھر میں اس مقدس ماحول کے وجود کا احساس تک نہ تھا۔ بلکہ اس گھر میں ایک دکھ بھری، ایک شکستہ سی بے چارگی تھکن بن کر اس کے چہرے پر اتر آتی۔ اور وہ دل ہی دل میں خود سے باتیں کرنے لگی۔ اندرونی خوشیاں کیا ہوتی ہیں، کہاں ملتی ہیں، کیا اب میں کبھی خوش رہ سکوں گی، شاید نہیں۔ شادی کی پہلی رات وہ اپنی اس ناکامی پر رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر نہ جانے کہاں سے ڈھیر سارے آنسو پلکوں کی باڑھ توڑ کر باہر نکل آئے۔ سوچ وفکر کے بھنور میں چکر کاٹتے ہوئے رات گزر گئی۔ صبح کا ہنگام آیا، مگر گھر کے ماحول میں ایک سکون افزاء سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ نماز صبح کی گہما گہمی تھی نہ تلاوت کلام پاک کی سحر آفریں آوازیں۔ اس کے دل سے آہ نکل گئی۔ وہ تو بچپن سے اس ماحول کی دلدادہ تھی اور اب سوچ رہی تھی، پروردگار میری نئی زندگی کا یہ کون سا رخ ہے جو میرے نظریات سے بالکل مختلف ہے۔ زندگی سے فرار حاصل کر کے راہبہ بن جانے کی تو میں نے کبھی تمنا نہیں کی تھی۔ مگر میرے دل کے اندر ایک دین دار گھرانے کی تمنا ضرور تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ ثاقب مذہبی بے راہ روی کے ساتھ ایک لاابالی انسان ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ حد درجہ بدمزاج، غصہ ور اور تنگ نظر بھی تھا۔ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنا اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ ایسے انسان کی رفاقت میں اس کی زندگی اس درجہ ویران اور ہولناک بن گئی کہ اس کے حسین خواب کی ایک بھی تعبیر اس کے ہاتھ نہ لگ سکی۔ زیست کے اس مرحلے پر وہ اپنا سب کچھ ہار بیٹھی۔ اس کی زندگی جہنم بن گئی۔ وہ لٹی لٹی بکھری بکھری سی اپنا زرد چہرہ لئے ہر وقت گھر کے کاموں میں مشغول رہتی۔ ثاقب کی بدعنوانیوں کی وجہ سے اس نے وہ خواب ہی دیکھنا چھوڑ دیا جس کی تعبیر اس کے بس میں نہیں تھی۔ اب وہ تھی اور اس کے ساتھ اس کے گذشتہ خوابوں کی پرچھائیاں

تھیں۔ شادی کے قبل محفل سماع اور محرم کی مجلسوں کی وہ روحِ رواں تھی۔ اس کی آواز کو خدا نے بلا کا سوز عطا کیا تھا۔ ہر مجلس میں وہ خوش الحانی کے ساتھ نوحے کا یہ پر اثر بند ضرور پڑھتی تھی

کفر والحاد کا ہر سو ہے اندھیرا اٹھو

مطلعِ دین پر تم بن کے سویرا اٹھو

وہ پاک ماحول وہ شب و روز اب اس سے دور ہو چکا تھا۔ ثاقب صبح ناشتہ کرنے کے بعد آفس چلے جاتے اور رات کو دیر سے گھر لوٹتے۔ ریٹائرڈ سسر کو گھر کے کسی مسئلے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کی اپنی ایک الگ دنیا تھی۔ وقت پر ناشتہ کھانا لینے کے بعد وہ اخبار یا کتب بینی میں مشغول رہتے یا پھر اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ کہیں نکل جاتے۔ اس مختصر سے لاابالی خاندان کے ساتھ وابستہ ہو کر حجاب خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی۔ اسے ہر وقت یہ احساس ستاتا رہتا کہ وہ جن لوگوں کے درمیان آگئی ہے انہیں اس دنیا کی لذتوں، رنگینیوں اور رعنائیوں کی چاہ نے محبت کے فطری جذبوں سے محروم کر دیا ہے۔ ان کے دل اخلاص و محبت سے عاری ہیں۔ ثاقب اسے مشرقی لباس میں سر پر دوپٹہ ڈالے سادگی سے رہتے ہوئے دیکھ کر کہتے ''کیا تمہیں صرف جاہلانہ طرزِ زندگی کا لباس پسند ہے؟'' وہ نرمی کے ساتھ جواب دیتی ''ہاں ثاقب یہ لباس مجھے از حد پسند ہے کیونکہ یہ لباس ہماری مشرقیت کی پہچان ہے۔ وہ لباس ہمیں زیب نہیں دیتا جو ہماری اپنی انفرادیت سے ہمیں بیگانہ کر دے۔ ہماری پہچان کو گنوا دے۔'' ثاقب چیں بہ جبیں ہو کر کہتے ''آج جب دنیا ترقی کی آخری منزل پر ہے، تب بھی تم دقیانوسی خیالات کی حامل ہو۔'' حجاب شوہر کو سمجھانے کے انداز میں کہتی ''ثاقب انگریزی تعلیم حاصل کر کے اور مغربی طرز معاشرت کو اختیار کر کے آپ اپنے دینی اقدار کو کھو بیٹھے ہیں اور مغربیت کی ظاہری چمک دمک میں گم ہو کر اپنی مشرقی پہچان اور مذہبی اصول و فرائض کو فراموش کر چکے ہیں۔ اس مادہ پرستی نے آپ کو گمراہ کر کے راہِ مستقیم سے بھٹکا دیا ہے۔'' حجاب کے ہر طرح سمجھانے پر بھی ثاقب کا ذہن ان نظریات کو

قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ انجانے طور پر ثاقب سے دور ہوتی چلی گئی۔ شوہر کی موجودگی کے باوجود وہ خود کو اس کی یکجائیت سے محروم پاتی۔ اس کے ہر طرف اجڑے دیار کی سی ویرانی چھا گئی۔ تاریکیوں کے مرغولے گہرے ہو گئے۔ بے چینیوں اور بے قراریوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ یہ جان کر ایک بے چین زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی کہ جب دکھ کا کوئی مداوا نہ مل سکے تو انسان کو اس سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے۔ ایسے وقت میں کبھی کبھی اس کے تصور کی دنیا میں ایک چہرہ ابھرتا سنجیدہ، پروقار، الجھے الجھے گھونگھریالے بال، جھکی جھکی آنکھیں، چہرے پر شرافت کا نور، یہ چہرہ احسان کا تھا جو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اس وقت سے پوشیدہ تھا جب اس نے جوانی کی سرحد میں قدم رکھا تھا۔ انجانے لمحوں میں جب احسان کے گھر کے پاکیزہ ماحول کی خوشبو جاگ اٹھی تو اپنے ویران سے کمرے میں وہ لمحات اسے خود کے اندر ایک جانکنی کی سی کیفیت لئے محسوس ہوتے اور وہ بے قرار ہو کر سوچنے لگتی کہ جب گزرے ایام لوٹ کر نہیں آتے تو پھر دل کے اندر یادوں کے چراغ کیوں روشن ہو جاتے ہیں۔

احسان کے گھر وہ اس کی بھابھی سے ملنے جایا کرتی تھی۔ کبھی سوئٹر کے ڈیزائنیں اور کبھی کشیدہ کاری کے نمونے سیکھنے کے لئے۔ احسان اور اس کی بھابھی کی محبت نے ہی اس کے دل کے اندر مذہبی جذبات کو ابھارا تھا۔ اس گھر کے افراد اپنی قدیم روایات و اقدار سے پیار کرنے والے تھے۔ احسان کی بھابھی کی شخصیت ایک مثالی اور متاثر کن شخصیت تھی۔ ان کا تعلق ایک دینی گھرانے سے تھا۔ اس لئے ان کے کردار پر مذہب کی بڑی گہری چھاپ تھی۔ وہ مہینے میں ایک بار محلے کی عورتوں کو جمع کر کے درس قرآن اور حدیث دیا کرتی تھی جس میں دینی مسائل کو بہت خوش بیانی سے سمجھاتی تھیں۔ ان کے حسن بیان اور حسن اخلاق کا یہ اثر تھا کہ عورتیں ان کی بتائی ہوئی باتوں پر فوراً عمل کرنے لگتی تھیں اور اپنی بچیوں کو روزانہ ان کے پاس بھیجا کرتی تھیں تا کہ ان کی قربت میں وہ کچھ اچھی باتیں سیکھ سکیں۔ اپنی شیریں بیانی کے ذریعے وہ کم سن بچیوں کو سمجھایا

کرتیں کہ اسلام عاجزی انکساری اور صبر و قناعت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے کہ تعلیم ہی انسان کا سرمایۂ حیات ہے اور محبت الفت غم گساری، ہمدردی، شیوۂ انسانیت ہے۔ دولت کے حصول کو اپنا مقصد حیات بنالینا انسان کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ دولت و ثروت آنے جانے والی شے ہے اور شہرت کو بہت جلد پر لگ جاتے ہیں۔ اگر کوئی شے باقی رہ جاتی ہے تو وہ ہے انسان کا اعلیٰ کردار۔ اس لئے اپنے کردار و اخلاق کو اتنا بلند کر لینا چاہئے کہ کسی دوسرے کو اس کے کسی فعل سے آزار نہ پہنچے۔ ان کے پاس آتے جاتے وہیں حجاب کی ملاقات احسان سے ہوئی تھی۔ سیدھا سادا مجسم سادگی کا نمونہ اسلامی اصولوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک باوقار نوجوان۔ ذہنوں کی یکسانیت دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے گئی تھی۔ یہ قربت جب آہستہ آہستہ چاہت کے رنگوں میں ڈھل گئی تو حجاب احسان کے لئے وہ ہستی بن گئی جس کے لئے مجنوں صحراؤں میں بھٹکنے کے لئے مجبور ہو گیا تھا۔ حجاب کی اٹھارہویں سالگرہ کا دن تھا۔ اس روز چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔ گھر کے ڈرائنگ روم میں دوسرے مہمانوں کے ساتھ احسان اور اس کی بھابھی بیٹھے بڑی دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ حجاب کے چہرے پر شفق سی پھوٹ رہی تھی اور اس کا انگ انگ خوشی کی پھوار سے بھیگ رہا تھا۔ احسان کا چہرہ بھی بھرپور مسرت کی غمازی کر رہا تھا۔ سالگرہ کے اس موقع پر جہاں تمام لوگوں نے اپنے تحفے میں آرائشی سامان دیئے تھے وہیں احسان نے اسے چھوٹا سا خوبصورت قرآن مجید پیش کیا تھا اور اس نے کہا تھا ''حجاب یہ صحیفۂ ربانی ہم مسلمانوں کے لئے پروردگار کی طرف سے عطا کیا ہوا ایک نادر تحفہ ہے۔ اس کی برکت سے اللہ کے کرم کا سایہ ہوگا۔

اس پرمسرت ماحول میں احسان کی نظریں حجاب کے خوبصورت چہرے پر جمی تھیں اور ان میں چاہت کی پرچھائیاں رقص کناں تھیں۔ حجاب ایک عجیب سے نشے میں سرشار تھی۔ اس کی نظریں بار حیا سے جھکی تھیں۔ اس کے رخسار احسان کے تئیں نگاہوں کی حدت سے سلگ رہے تھے۔ کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد احسان اپنی بھابھی کے ساتھ چلے گئے۔ ان کے جانے کے

بعد حجاب کے ہونٹوں پر اندرونی خوشی سے ایک آسودہ مسرت کھیل رہی تھی۔ ثاقب کی محبت کے ساگر میں اس کا دل ڈوب چکا تھا۔ احسان کے ذہن و دل کی بھی بالکل یہی کیفیت تھی۔ دونوں کے دل کی دھڑکنیں ایک ہی تال سے ہم آہنگ تھیں۔ ایک ہی جذبہ تھا جو دونوں کی روحوں میں سما کر پارے کی طرح مچل رہا تھا۔ ابھی یہ معصوم محبت پروان چڑھ رہی تھی کہ حجاب کے ابو نے احسان کے گھر کے ساتھ اس کے جذباتی لگاؤ کو محسوس کیا اور ایک دن اس کی والدہ کو اس لگاؤ کی بابت آگاہ کرتے ہوئے ان سے کہا کہ احسان کے گھر والوں کے ساتھ حجاب کا یہ والہانہ لگاؤ ایک دن ہمارے لئے مشکلات پیدا کر سکتا ہے کیونکہ ان کا گھرانہ ایک قدامت پسند گھرانہ ہے۔ اس گھر کے ماحول نے حجاب کے ذہن میں قدامت پرستی کی باتیں پیدا کر دی ہیں۔ آج کے دور میں زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے ورنہ سماج میں عزت ملنا مشکل ہے۔ حجاب کی امی ان کے اس خیال سے متفق تھیں، چنانچہ ایک دن موقع پا کر انہوں نے حجاب کو پیار سے سمجھایا "حجاب تم کوئی ایسا کام نہیں کرو گی جس سے گھر کی عزت خاک میں مل جائے۔ تم اس گھر کی آبرو ہو۔ بیٹی تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ احسان کا گھرانہ ہمارے گھرانے کے اسٹیٹس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد والدین کی رضا کی خاطر وہ احسان سے کنارہ کش ہوتی چلی گئی۔ ابھی وہ ٹوٹے ہوئے دل کا رفو بھی نہیں کر پائی تھی کہ ابو نے ثاقب سے اس کی شادی طے کر دی۔ شادی کے بعد اتنا ہی نہیں کہ حجاب صرف ثاقب کے گھر آ گئی بلکہ از روئے شریعت اس سے محبت بھی کی۔ اسے سہارا، پیار، اعتماد سب کچھ دیا تاکہ وہ اپنی زندگی میں کوئی خلاء محسوس نہ کر سکے۔ مگر ثاقب نے اس کے پیار کو اس کی کمزوری اور چاہت کو احمقانہ حرکت سمجھ کر اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ وقت اس کی جھولی میں تلخیوں کی سوغات ڈالتا ہوا گذرتا جا رہا تھا کہ ابو کی اچانک موت کی خبر سن کر وہ کچھ دنوں کے لئے میکے آ گئی۔ اپنے وجود کے اندر ڈھیر سارے دکھوں کا انبار سمیٹے۔ اس کے آنے کی خبر سن کر احسان اس سے ملنے کے لئے آئے۔ حجاب نے اپنی سوگوار پلکیں اٹھا کر احسان کی طرف دیکھا تو اس کی

آنکھوں میں انہیں حسرتوں کے لاشے تیرتے ہوئے نظر آئے۔ یہ دیکھ کر انہیں لگا کہ جیسے ابھی ابھی ان کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔ ایک معصوم، نازک سی کلی کا یہ انجام دیکھ کر ان کا دل کراہ اٹھا اور ان کی آنکھیں اس کے زرد چہرے پر ٹکی رہ گئیں۔ بوجھل اور سسکتا ہوا ماحول، اداس اداس کربناک فضا، ویران لمحہ، ہولناک سناٹا ان کے چاروں طرف لہریں لے رہا تھا اور آنسو ان کی آنکھوں میں سنگریزے بن کر کھٹک رہے تھے۔ اس یاس انگیز سکوت کو توڑتے ہوئے انہوں نے حجاب کو مخاطب کر کے کہا ''تمہیں دیکھ کر مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے حجاب کہ تم صبر وضبط کی کن منزلوں سے گزر رہی ہو۔ پھر بھی میں تم سے یہ گذارش کروں گا کہ تم اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کرو ورنہ اس طرح تم زندہ نہیں رہ سکو گی۔ تمہارا دل ایک دن پاش پاش ہو کر بکھر جائے گا۔ اس لئے خود پر اتنا سنگین ظلم نہ کرو۔ اپنے آپ کو اس طرح برباد نہ کرو۔'' حجاب نے اپنی پرنم آنکھوں سے احسان کی طرف دیکھا جن کا چہرہ احساس کرب سے بالکل سیاہ پڑ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے تھمے ہوئے آنسو پلکوں کی باڑھ توڑ کر باہر نکل آئے اور اس نے احسان سے کہا ''احسان حالات کی ستم گری سے شکست کھا کر میں نے ہر جذبے کو فراموش کر دیا ہے اور خود کو پتھر میں تبدیل کر لیا ہے۔ اب میرے پورے وجود پر برف سی جم چکی ہے۔ اس کے خاموش ہوتے ہی احسان نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ اس کے سینے کے اندر ایک طوفان سا برپا ہے۔ وہ اندر ہی اندر ایک گھائل پنچھی کی طرح تڑپ رہی ہے اور اس کے وجود کی دھجیاں سی بکھرتی جا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اس سے ایک سوال کیا ''کیا تم کچھ دنوں کے لئے یہاں رک نہیں سکتیں حجاب؟'' حجاب کے چہرے پر ایک دھواں سا پھیل گیا اور اس نے کہا ''نہیں احسان میں کل یہاں سے چلی جاؤں گی۔ ہماری یہ ملاقات شاید آخری ملاقات ہو۔ احسان اگر میں ایک ناکام زندگی گزارنے پر مجبور ہوں تو یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ مجھ سی نہ جانے کتنی ناکام زندگیاں دکھوں کی صلیب پر ٹنگی ہیں۔ آپ میری اس ناکام زندگی کو محسوس کر کے حد درجہ پریشان نہ ہوں۔

بلکہ اس وقت مجھ سے کچھ اچھی باتیں کرلیں۔ تاکہ جب میں یہاں سے جاؤں تو میرے دل پر کسی قسم کا کوئی بوجھ نہ رہے اور آج کی یہ آخری ملاقات میری دکھی زندگی کے لئے ایک انمول تحفہ بن جائے۔ احسان کے ذہن کے اندر غم کی آندھیوں کے بگولے اٹھ رہے تھے اور ان کا دل ایک ناقابل بیان بوجھ کے نیچے دبا جارہا تھا۔ ان کا دل یہ سوچ کر کراہ اٹھا کہ کل وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ پھر ہوسکتا ہے کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اس سے کبھی ملاقات نہ ہوسکے۔'' انہوں نے سر اٹھا کر بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور نہ جانے کس جذبے کے تحت ان کی زبان سے نکل گیا ''حجاب نہ جانے کیوں میرے دل کے اندر کبھی کبھی یہ یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ ہم ایک دن ضرور مل جائیں گے۔ ایک آس سی بندھ گئی ہے جو ٹوٹتی نہیں۔'' حجاب نے جواب دیا ''احسان یہ خواب وخیال کی باتیں ہوسکتی ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں بلکہ حقیقت تو اب یہ ہے کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور تم میرے لئے محض ایک سایہ، جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اتنا کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ احسان بھی اپنے گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے سے باہر نکل گئے۔ شاید وہ رات ان دونوں پر بہت بھاری گزری ہوگی۔ دوسرے دن وہ اپنے سسرال واپس لوٹ گئی۔

سسرال کے شب و روز معمول پر گزر رہے تھے کہ ایک دن اس گھر کے اندر ایک بھیانک زلزلہ آگیا۔ اس روز بھی ثاقب ناشتے کے برتنوں پر غصہ اتارنے کے بعد باہر چلے گئے تھے اور وہ برتنوں کو زمین پر سے اٹھا کر رکھنے میں مشغول تھی کہ دفعتاً باہر سے کچھ لوگوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں جب وہ کچن سے باہر نکلی تو دیکھا کہ لوگ ٹرک سے کچلی ہوئی ثاقب کی لاش لے کر اندر آرہے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی وہ لہرا کر زمین پر گر گئی اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی چوڑی ٹوٹ چکی تھی اور گھر میں ہر طرف ایک کہرام برپا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جب حالات کچھ معمول پر آگئے تو اسے پتہ چلا کہ اس کی زندگی کا ایک باب ختم

ہو چکا ہے۔اس کے بعد اداس اداس سے لمحوں کی تنہائیوں سے اکتا کر ایک دن اس کے سسر اس سے بغیر کچھ کہے گھر چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ان کے جانے کے بعد وہ بھی اپنا اجڑا وجود لے کر ماں کے سینے سے آ لگی۔چالیسویں کے بعد احسان ایک دن اس سے ملنے کے لئے آئے اور موقع پاتے ہی دبے لفظوں میں اس سے پوچھا ''اب تم کب واپس جاؤ گی؟'' کبھی نہیں اس نے جواب دیا'' اس وقت احسان کے اندر نہ جانے کہاں سے اتنا حوصلہ پیدا ہو گیا کہ انہوں نے پہلی بار اس سے کہا 'حجاب مجھے تم سے یہ سب کچھ کہنا تو نہیں چاہئے مگر حالات کے پیش نظر میں تم سے یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ اگر تم مجھے اس قابل سمجھو کہ اپنی زندگی کے اس تنہا سفر میں مجھے اپنا ہم سفر بنا لو تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔'' حجاب احسان کی اس بات کا اپنی زبان سے تو کوئی جواب نہ دے سکی مگر اس کی بار حیا سے جھکی ہوئی پلکوں کے ذریعے احسان کو اس کا جواب مل گیا اور فرطِ مسرت سے ان کا دل جھوم اٹھا۔کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد حجاب نے اس روز ایک عرصہ کے بعد آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ثاقب کے گھر سے آئے ہوئے اسے چند ہفتے ہی ہوئے تھے مگر ان چند ہفتوں میں ہی اس کے چہرے کی رنگت نکھر گئی تھی۔بجھی بجھی آنکھوں میں خوشیوں کے دیپ جل اٹھے تھے اور زرد زرد رخساروں کی رنگت گلابی ہونے لگی تھی۔دن گزرنے کے بعد جب رات آئی تو اس رات اس کا دل ایک وجدانی کیفیت سے ہم آہنگ ہوتا رہا۔احسان کا میٹھا لہجہ اس کی روح میں گھل رہا تھا اور اس کی ہر دھڑکن کے ساتھ ایک آواز آ رہی تھی ''احسان مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری زندگی کے تانے بانے آپ کی زندگی کے تانے بانے سے اس طرح الجھ گئے ہیں جیسے اب کبھی الگ نہ ہو سکیں گے۔آپ میری پناہ گاہ بن چکے ہیں۔میرا سائبان بن چکے ہیں۔آپ سے مجھے اپنی شناخت ملی ہے ورنہ میں تو ایک ٹوٹا ہوا بد ہیئت ڈھیر تھی جسے آپ کی انسانیت نے دوبارہ ایک خوبصورت پیکر میں ڈھال دیا ہے۔خیالات کے بھنور میں ہچکولے کھاتے ہوئے آخر حجاب کو نیند آ گئی۔رات کا آخری

پہر گزرنے کے قریب تھا۔ صبح صادق کی نورانی کرنیں آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی تھیں اور حجاب صدائے موزن پر بیدار ہو کر نماز صبح ادا کر کے تلاوت کلام پاک میں مشغول تھی۔ آج ایک عرصہ کے بعد وہی مقدس ساعتیں، وہی برکتوں کی گھڑیاں، وہی پاک و پاکیزہ لمحے جن سے انسان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ وہ اس کے اردگرد اپنا سایہ کئے تھے۔ اور وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ پروردگار اپنے یاد کرنے والوں پر رحمت کے موتی اس طرح لٹاتا ہے کہ مانگنے والوں کی جھولیاں بھر جاتی ہیں۔ یہی اس کی شان کریمی ہے۔ پھر ایک ٹھنڈا ٹھنڈا میٹھا نرم نرم سا سکون اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔

☆☆☆

ختم شد
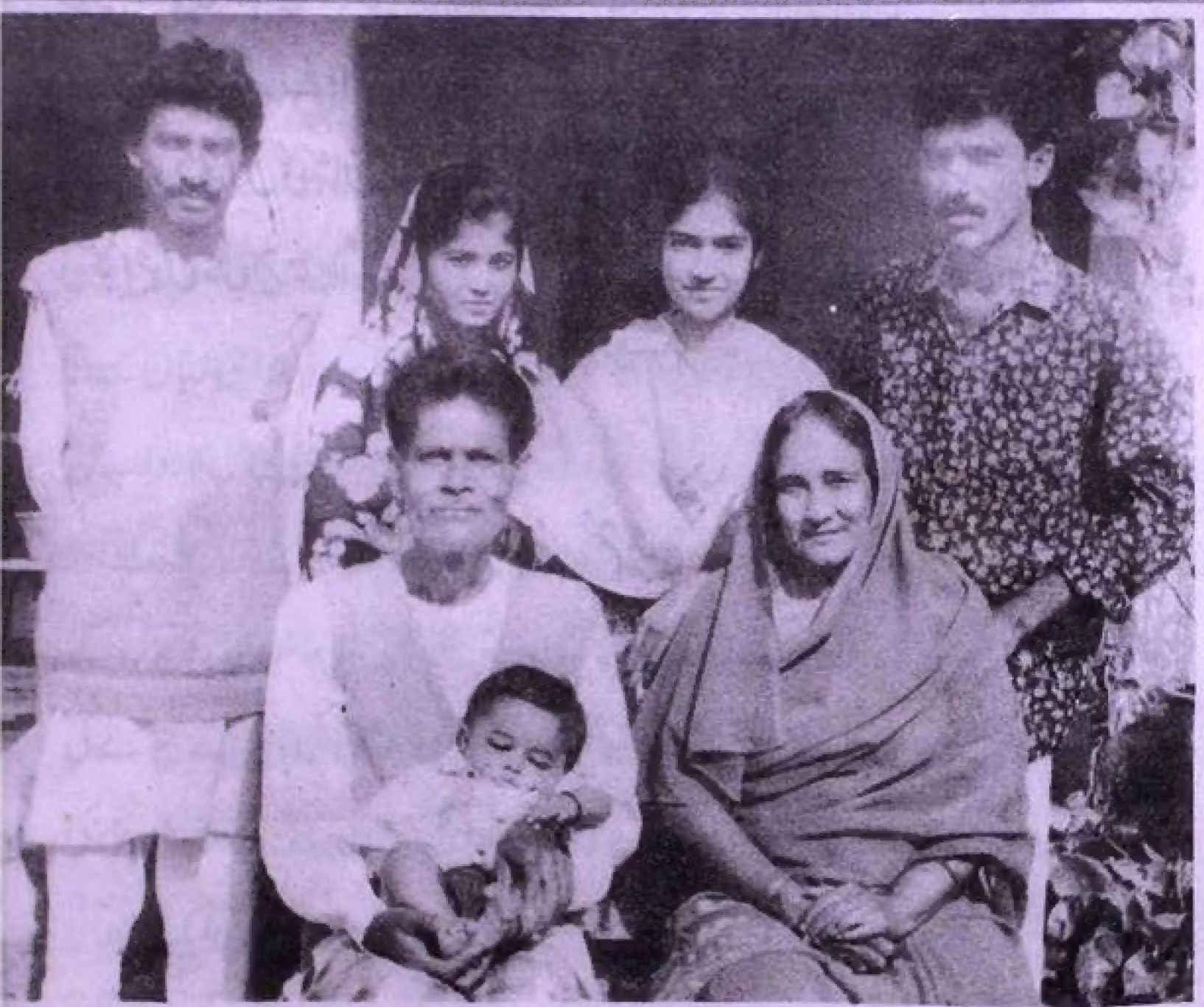
امتیاز فاطمی اپنی فیملی کے ساتھ

مگر یہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں
کہ یہ گھر کب ہے۔ یہ تو ایک قبرستان ہے۔
کسی کی آرزوؤں کا مدفن ہے۔ ایک ایسی
بدنصیب لڑکی کی تشنہ تمناؤں کا مزار ہے جو اپنی
نارسائی کا بوجھ نہ اٹھا سکی اور اس گھر کی خاک
پر ڈھیر ہو گئی۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ گھر اپنی
تمام تر خوبصورتی کے ساتھ انتہائی بدصورت
اور خوفناک بھی ہے۔ یہ وہ بھیانک گھر ہے جو
کبھی میری پیاری سہیلی سیمی کو اس کی
معصومیت اور بھولے پن کے ساتھ نگل گیا
ہے۔ کاش لوگ اس گھر کی خوش نصیبی کے پس
پشت چھپی ہوئی کسی بے گناہ لڑکی کی ان
دکھوں کی جھلکیاں بھی دیکھ سکتے ہیں جو بے
ایمانی اور بے وفائی کی قربان گاہ پر قربان
کر دی گئی۔ وہ معصوم سی لڑکی سر سے پاؤں
تک ایک ایسا سمندر تھی جو اندر ہی اندر سفر
کرتے کرتے خاموشی کے ساتھ خس و
خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے جس کے باہر نہ
کبھی کوئی بوند برستی ہے نہ ہی کوئی طوفان اٹھتا
ہے اور نہ کوئی آندھی چلتی ہے۔ تب ہی تو وہ
بھولی بھالی نادان لڑکی بھرپور جوانی میں ہی
سکون کی چادر اوڑھ کر سو گئی۔

اردو ادب کے حوالے سے آزادئ ہند کے بعد کے افسانہ نگاروں پر نظر ڈالی جائے اور بیسویں صدی کے آخری ربع کی خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست مرتب کی جائے تو امتیاز فاطمی کے نام کے بغیر یہ فہرست مکمل نہیں ہوگی۔ امتیاز فاطمی صرف افسانہ لکھتی ہیں۔ ان کے افسانے نسوانی ادب کے بہترین ترجمان ہیں۔ امتیاز فاطمی کی تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ادب انہیں وراثت میں ملا ہے۔ امتیاز فاطمی اردو کے مشہور شاعر شاد عظیم آبادی کے پوتے بہزاد فاطمی (جو کہ خود شاعر ہیں) کی بیٹی ہیں۔ اس لئے امتیاز فاطمی کا خاندانی سلسلہ ادب کے جن آفتاب و ماہتاب سے ملتا ہے، ایسی صورت میں اگر امتیاز فاطمی کی ادبی وابستگی نہ ہوتی تو یہ بات قابل غور تھی لیکن امتیاز فاطمی نے اپنے خاندانی سلسلے کو قائم رکھا اور اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے ہندوستانی سماج کے ان مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جس کا براہ راست تعلق عورتوں سے ہے۔ عورتوں کے حقوق و مسائل کو وہ بخوبی قلم بند کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر کردار ایسی لڑکیوں کے ہیں جو حسین زندگی کے خواب تو دیکھتی ہیں لیکن انہیں اصل زندگی میں جہیز اور غریبی جیسی لعنت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور آخر کار وہ زندگی کے ہاتھوں ہار جاتی ہیں۔ یہ آج بھی مسلم معاشرے کی حقیقت ہے جس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ امتیاز فاطمی کے افسانے ہمیں اپنے گرد و پیش کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں ان کے افسانوں میں جو کردار نظر آتے ہیں وہ ہمارے سماج میں آج بھی زندہ ہیں۔ یہ تمام کردار مظلومیت کی ایک درد بھری داستان ہیں جو قاری کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ امتیاز فاطمی کے افسانوں میں فنی اعتبار سے وہ تمام لوازمات موجود ہیں جن کی شمولیت کے بعد کوئی بیان افسانہ بن جاتا ہے۔ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی، ڈاکٹر نصرت جہاں اور امتیاز فاطمی یہ تین نام ایسے ہیں جن کے افسانے عصر حاضر میں قاری کی ذہنی آبیاری کر رہے ہیں۔ امتیاز فاطمی کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے ان کا یہ تیسرا افسانوی مجموعہ 'فسانہ خون دل کا' قاری کے حوالے ہے۔

ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی، نئی دہلی